میثم قادری

استاذ العلماء

مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڑھی قدس سرہ

تالیف: نواب محمد حبیب الرحمن شروانی

تکمیل: خواجہ رضی حیدر

مکتبہ قادریہ ۰ لاہور

اُستاذ العُلما

۱۳۳۴ھ

یعنی

حضرت مفتی محمد لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح عمری

مؤلّفۂ

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

ضمیمہ

خواجہ رضی حیدر (کراچی)

مکتبۂ قادریّہ ○ لاہور

کتاب ———— اُستاذ العلماء

تالیف ———— نواب محمد حبیب الرحمٰن شروانی

تقریظ، مولانا مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی بر انوارِ ساطعہ صفحہ ۵۶ تا صفحہ ۵۸

تقریظ، فرزند مولانا " " بر حضور کی گیارہویں صفحہ ۵۹ تا صفحہ ۶۰

ضمیمہ ———— خواجہ رضی حیدر (کراچی)

صفحات ———— ۷۲

مطبع ————

تاریخِ اشاعت ———— رجب ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء

ناشر ———— ممتاز احمد قادری و انوار احمد چشتی

تزئین و آرائش ———— محمد عاشق حسین ہاشمی خوشنویس

قیمت تین روپے

ملنے کا پتا

مکتبہ قادریہ ◎ لاہور

جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ

فہرست مضامین

(استاذ العلما)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصبات کا عظیم الشان نظام

جب اس خاکدانِ سفلی میں اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی اور اُس کے فیض سے ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں برِ اعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اُس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا۔ یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جن سے شہر (خصوصاً دار السلطنت) سیراب و شاداب رہتے۔ شہری آب و ہوا دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سُست اور پست کر دیتی تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے اور بزمِ حیات کو از سر نو پرنور و معمور فرما دیتے۔ دہلی مرحوم میں شاہ صاحب کا اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں۔

ہمارا کول (علی گڑھ) بھی دورِ حیات میں اپنے قصبات پر نازاں تھا۔ جلیسر (قدیم جالیسر) سے نصرت خاں عہد علائی کا امیرِ نامور اُٹھا۔ امیر خسرو

پٹیالی سے جا کر دار السلطنۃ بلکہ دنیا کا فخر بنے۔ جلالی کے ذکر سے سفرنامہ ابن بطوطہ معمور ہے۔

وطن | انہی بستیوں میں سے ایک بستی پلکھنہ ہے جو قصبۂ جلالی کے قریب آباد ہے۔ اس کی قدیم عظمت کی یادگار عہدِ بابری کی مسجد ہے۔ شیخ گھورن تاریخی ہستی ہیں۔ اسی معدن سے وہ جوہرِ فرد نکلا جس کے انوار نے اس دورِ آخر میں علمی مجالس کو منوّر و تاباں فرما دیا۔

خاندان | کول اور اُس کے ملحقہ قصبات و دیہات میں شیوخ کے خاندان آباد ہیں جو حضرت شمس العارفین شاہ جمال کی نسل میں ہیں

یہ بزرگ اپنے وقت کے اولیاء کرام میں تھے۔ ابن بطوطہ جب کول آیا تو آپ ہی کے پڑوس میں اُترا تھا۔ سفرنامے میں حضرت کا ذکر کرتا ہے۔

جو شجرہ اس خاندان میں محفوظ ہے وہ شاہد ہے کہ شیوخ جمالی حضرت امین الامۃ ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ اشکال یہاں یہ ہے کہ امام ابن قتیبہؒ نے المعارف میں حضرت امین الامۃ کے ذکر میں لکھا ہے "لا عقب لہ"۔ محمد لطف اللہ صاحب اسی خاندان سے تھے۔

والد مولوی اسد اللہ فارسی خواں، کول میں وکالت کرتے تھے۔ اسی آمدنی سے بفراغت گزر تھی، تمغائے شرافت قصبہ میں املاک بھی تھی جو بھائی کے لئے چھوڑ رکھی تھی، اُردو شعر کا ذوق تھا، ایک شعر یاد کر لو

لے اُڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

منشی نبی بخش سالک اکبرآبادی نے ایک جنتری کا ذکر کیا ہی جس سے بارہ ۱۲ برس کی تاریخیں معلوم ہوجاتی تھیں۔ اُنھوں نے چند اشعار لکھے جن سے جتنے سال کی تاریخیں چاہو نکل آتی ہیں۔ رعد مرحوم نے اپنی بڑی جنتری میں چھاپے تھے، میرے پاس بھی محفوظ ہیں۔

آخر عمر میں ضیق النفس میں مبتلا ہوکر خانہ نشین ہو گئے تھے، والدہ سید غلام علی حسینی النسب ساکن علیسر کی دختر نیک اختر تھیں۔ دو چچا تھے، بڑے منشی ہبتہ اللہ فارسی کے ماہر، بڑے شاطر، املاک کا کام کرتے تھے۔ شطرنج کی بہت سی چالوں کے نقشے قلمبند کئے تھے جو ایک ضخیم مجلد میں خاندانی کتاب خانے میں محفوظ ہیں۔ فرائض کا ایک رسالہ بھی خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا۔ چھوٹے حکیم اکرام اللہ طبیب تھے، دیرہ دون میں ایک انگریز کا معرکے کا علاج کیا تھا۔ اس نے نوکر رکھ لیا، وہیں وفات پاکر مدفون ہوئے۔ بھتیجے نے تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا۔ ان دونوں بھائیوں کے نرینہ اولاد نہ تھی۔

پیدائش محمد لطف اللہ صاحب پلکھنے میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، باپ نے تاریخ کہی "چراغم"۔ باپ کے اکلوتے بیٹے بلکہ تین گھروں کا چراغ۔

ناز و نعمت، لاڈ پیار میں پرورش ہوئی۔ جامع حالات صاحبزادے نے لکھا ہے کہ اسی پرورش کا اثر تھا کہ مزاج میں ایک ضد تھی جو آخر عہد تک باقی رہی۔

بچپن کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ لطف اللہ ان کھیلوں میں تو ہمارے شریک ہو جاتے جو شرفا کے لڑکے کھیلتے ہیں۔ عامیانہ کھیلوں میں شرکت نہ کرے۔ مثلاً گولیوں کا کھیل۔ ہم جب ایسے کھیل کھیلتے تو وہ الگ بیٹھے دیکھتے رہتے

نماز کے بچپن سے عادی تھے۔

ابتدائی تعلیم | پکھنے میں ایک میاں جی موہن لال نامی تھے جو بچوں کو ابتدائی کتابیں کریما، یامقیما وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ اُنہی سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک روز ایک لڑکا خالق باری پڑھ رہا تھا ع "راسو نولا ہے جان" معصوم لطف اللہ نے ایک ہم مکتب سے کہا " نولا راسو ہے تو بنولا (پنبہ دانہ) براسو ہوگا"۔ دیکھو یہی انتقالِ ذہن زینت درس بنا۔

ابتدائی رسالے گھر پر پڑھ کر جلیسر اپنی نانیہال میں گئے۔ وہاں مولوی محمد عظیم اللہ سے فارسی پڑھی۔ انتہائی کتابیں اپنے پھوپھا مولوی حفیظ اللہ خاں سے (جن کے خاندان میں خانی کا خطاب شاہی تھا) پڑھیں۔ یہ بڑے خطاط تھے، خاص وصف یہ تھا کہ چند روز میں شاگرد کا خط اپنے خط میں

ملا دیتے تھے۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ میرے خط کی روش پھوپا صاحب کے خط کی روش پر ہے۔ مولوی عبدالغنی خاں صاحب شاگرد رشید نے اولاً یہ روش اُستاد سے حاصل کی۔ صاجزادے بھی عموماً اسی روش پر لکھتے ہیں جو نظر فریب اور منشیانہ پختہ ہے۔

بعض فارسی کی کتابیں مثلاً بہار دانش اپنے خسر سید رونق علی سے بھی پڑھیں۔

تعلیم علوم | فارسی سے فارغ ہو کر پندرہ[۱۵] برس کی عمر کے بعد اُس آستانے پر حاضر ہوئے جہاں سے سند فضیلت ملنی مقدر تھی۔

اوپر سُن چکے ہو کہ مولوی صاحب کے والد مولوی اسد اللہ وکالت کرتے تھے، اسی سلسلے میں مفتی عنایت احمد صاحب سے تعلقات تھے جو کول میں مفتی و منصف رہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب شاگرد تھے مولوی بزرگ علی صاحب کے۔

مولوی بزرگ علی صاحب | مشہور مردم خیز قصبۂ مارہرہ کے کنبوہ خاندان سے تھے۔ وہیں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حسن علی، خواجہ حسن ملتانی کی دسویں پشت میں۔ آغاز شباب تک باوجود باپ کی تاکید کے علم کی تحصیل کی جانب متوجہ نہ ہوئے۔ عشق مجازی کے اثر سے فارسی غزل کا ذوق تھا۔ شوق تخلص کرتے تھے۔ زیادہ تاکید ہوئی تو گھر سے نکل گئے۔ بالآخر باپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت

شاہ آلِ احمد صاحب عرف "اچھے میاں" کی خدمت میں دعا کی التجا کی۔ دعا فرمائی جو مستجاب تھی۔ تمام مشاغل چھوڑ کر تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔ اب شوق تھا تو کتاب کا، طلب تھی تو علم کی۔ فرماتے تھے لوگ جوانی میں زندگی کے لطف حاصل کرتے ہیں ہم نے تو شباب علم کی نذر کر دیا۔ ابتداءً لکھنؤ اور کلکتہ میں علم حاصل کیا۔ وہاں کے اساتذہ کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ بالآخر دلّی میں اس درس گاہ والا میں حاضر ہوئے جو تمام ہندوستان کی ملجاؤ ماویٰ تھی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے علم حدیث حاصل کیا۔ ریاضی مولوی رفیع الدین صاحب (شاہ صاحب کے بھائی) سے پڑھی جو اس فن میں امامِ وقت تھے۔

تحصیل سے فارغ ہو کر خود درس کی خدمت شروع کی۔ آگرہ میں پڑھایا، کلکتہ کے دارالعلوم کے مہتمم رہے۔ حکام کے اصرار سے (جو اکثر شاگرد تھے) کول میں منصفی کا عہدہ قبول کر لیا۔ اسی زمانہ میں وہاں کی جامع مسجد میں اس مدرسہ کا احیا کیا جس کو عہد محمد شاہی میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے قائم کیا تھا (اس کا ذکر اخبار الجمال میں ہے)۔

بالآخر منصفی سے استعفا دے دیا جس کو شاگرد حکام نے تلمذ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے بہت تامل کے بعد منظور کیا۔ مستعفی ہو کر نواب وزیرالدولہ مرحوم کے اصرار پر ٹونک میں عہدۂ قاضی القضاۃ قبول کیا۔

آخر عہد تک وہیں رہے۔ سنہ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ ٹونک میں دفن ہیں، تاریخ نگار نے ان کے یہ اوصاف لکھے ہیں: تقویٰ، تدبر، تواضع، تہذیب، تقریر دل نشیں اور پُراثر۔ ایک بیٹے تھے مولوی محمد صدیق فارغ التحصیل، علم ہندسہ اور نجوم میں ماہر، نیز علم تعبیر رویا میں۔ ٹونک میں عہدہ قضا پر فائز رہے۔ سنہ ۱۲۹۲ھ میں وہیں رحلت کی۔

مولوی بزرگ علی صاحب کی تصانیف میں سے دیوان فارسی قلمی میرے یہاں ہے۔ کلام اوسط درجہ کا ہے، صاف ہے اور پر اثر۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گر جلوۂ او عام کند پردہ دری را — در شیشہ چو می جوش دہد مغز پری را
زلفت بشکست دل و دین او درستی — افراختہ قدت علم فتنہ گری را

نے صبر ماند بر جا اکنوں نہ تاب ما را — اے بے مروت آخر یک رہ بیاب ما را
کے صبح عید پیشِ صبحم فروغ یابد — چوں نور بخش صبح ست آں آفتاب ما را
در دور چشم مستت میخانہا خراب ست — تنہا نہ لال میگوں دارد خراب ما را

اس زمانہ کی شدید ضرورت کی بنیاد پر متعدد کتابیں فارسی زبان میں ردّ نصاریٰ میں لکھی ہیں۔ ان میں سے کتاب ردّ نصاریٰ کا ایک حصہ (" بشارات ") قلمی میرے یہاں بھی ہے۔ اس کا عنوان ہے " بشارات فارقلیط "۔ اس پر بعض عبارتیں مفتی عنایت احمد صاحب کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔

ایک اور قلمی رسالہ میرے یہاں ہے یہ ایک فارسی معمّا کی شرح ہے۔ جو قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں نے تفضل حسین کے نام پر لکھا تھا اور جس میں بہت سی علمی اصطلاحیں درج کی ہیں اس کا دیباچہ مفتی عنایت احمد صاحب نے اُستاد کی زندگی میں لکھا تھا۔ اس پر بھی مفتی صاحب کے قلم کی عبارتیں ہیں۔ یہ رسالے مفتی صاحب کے کتاب خانے سے اور کتابوں کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔

مفتی عنایت احمد صاحب | اپنے وطن دیوہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۹ شوال ۱۲۲۸ھ تاریخ ولادت ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں رام پور جاکر مولوی سید محمد صاحب بریلوی سے صرف و نحو اور مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی اور مولوی نورالاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے دلی جاکر شاہ اسحٰق صاحب سے حدیث پڑھی، دلی سے علی گڑھ آئے۔ مولوی بزرگ علی صاحب سے جامع مسجد میں پڑھا، فنِ ریاضی کی تکمیل کی۔ بعد فراغ یہیں مدرس مقرر ہوئے۔ ایک سال مدرس رہ کر مفتی و منصف کے عہدہ پر علی گڑھ ہی میں تقرر ہوگیا۔ اسی دور میں مولوی لطف اللہ صاحب کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانہ میں پڑھا۔ سید صاحب صاحبِ درس فاضل ہو جانے کے بعد بھی تعجب سے فرمایا کرتے تھے کہ

مفتی صاحب مجھکو ہدایہ اجلاس پر پڑھاتے۔ میں حاضر رہتا جب دوران مقدمہ میں فرصت ملتی اشارہ ہوتا۔ میں پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی اثنا میں پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔ باوجود اس کے ایسا پڑھایا کہ ساری عمر اُس کی یاد رہی۔

کول سے بریلی کا تبادلہ ہوا۔ بھیکن پور کے لئے ایک فخر یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے اثنار راہ میں مع مستورات کے قیام فرمایا تھا۔
بریلی کے قیام میں صدر امین ہوئے۔ وہاں کے تلامذہ میں قاضی عبدالجمیل صاحب قاضی شہر اور مولوی فدا حسین منصف شامل تھے۔
بڑا کارنامہ نواب عبدالعزیز خاں کو (باوجود ان کی آزاد منشی و صاحبزادگی کے) پڑھا دینا تھا۔ نواب صاحب نواب رحمت خاں حافظ الملک شہید مرحوم کے پوتے تھے۔ گزشتہ پراونشل کانفرنس کے موقع پر حافظ الملک شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ مقبرہ کی محراب میں یہ جوہردار شعر لکھا ہوا ہے

سرِ کُشتہ بر نیزہ می زد نفس
کہ معراجِ مرداں ہمین ست و بس

قصہ مختصر صدر اعلائی کا پروانہ آگیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا اس کے فرو ہونے پر الزام بغاوت میں انڈمان بھیج دیئے گئے۔ یہ

۱۲۷۴ھ کا واقعہ ہے۔ چار سال جزیرۂ مذکور میں رہے۔ جنگل میں منگل، اکابر علماء کے قدموں کی برکت سے اِن دنوں یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ علاوہ مفتی صاحب کے مولوی فضلِ حق صاحب خیرآبادی، مفتی مظہر کریم صاحب وغیرہ علما بھی وہاں تھے اور سب کے سب باوجود مصیبت قید اور غریب الوطنی کے خدمتِ علم میں مصروف تھے۔ محقق خیرآبادی کے ذہن وقّاد کے متعدد نتائج وہیں وجود پذیر ہوئے۔ مفتی مظہر کریم صاحب نے مراصد الاطلاع کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے کلام مجید حفظ کیا، تواریخ حبیب الٰہ سیرۃ میں تالیف کی۔ تاریخی نام ہے، ۱۲۷۵ھ نکلتے ہیں۔ منشی امیر اللہ تسلیم نے الفاظ "تواریخ نبی" سے تاریخ نکالی۔ یہ کتاب حکیم امیر خاں کی فرمائش سے لکھی گئی تھی جو انڈمان میں سرکاری ڈاکٹر تھے اور جن کی غم خواری کا اعتراف دیباچہ میں فرمایا ہے۔ حجم سوا سو صفحے کا ہے۔ فی صفحہ سطر ۲۰ (نسخہ مطبع نظامی ۱۲۷۹ھ پیش نظر ہے) واقعات پوری تفصیل سے بقید تاریخ اور تشریح جزئیات کے ساتھ لکھے ہیں۔ دیباچہ کی شہادت ہے کہ محض یاد سے لکھی گئی۔ قیاس کرو کہ اس عہد کے علما حضرتِ نبی کریم کے مبارک حالات کا کس قدر ذخیرہ سینے میں محفوظ رکھتے تھے اور یہی سرمایۂ سعادت تھا۔ ہندوستان آکر سیرت اور حدیث کی کتابوں سے مقابلہ کیا تو یاد کی صحت ثابت ہوئی۔ ایک انگریز نے

تقویم البلدان کے ترجمہ کی فرمائش کی جو دو برس میں ختم ہوا۔ یہی ترجمہ رہائی کا سبب بنا۔ صرف کا رسالہ علم الصیغہ بھی وہیں لکھا۔ ۱۲۷۷ھ میں رہائی پاکر کاکوری آئے۔ وہاں شاگرد رشید مولوی لطف اللہ صاحب بھی حاضر ہوئے۔ تاریخ پیش کی ؂

چوں بفضلِ خالقِ ارض وسما ۔۔۔ اوستادم شد زقید غم رہا
بہرِ تاریخِ خلاصِ آں جناب ۔۔۔ بر نوشتم اِنَّ اُسْتَاذِی نَجَا

۱۲۷۷ھ

مستقل قیام کان پور میں فرمایا۔ مدرسۂ فیض عام کی بنیاد ڈالی، خود درس دیا۔ پچیس یا تیس روپے ماہوار تنخواہ لیتے تھے۔ مسلمان تجار کان پور مصارف مدرسہ کے کفیل تھے۔ ان میں حافظ برخوردار زیادہ نامور تھے۔ اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلما کی شکل میں عیاں ہوا۔

دو برس کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ شاگرد جمع ہوئے۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب واصف بخاری، مولوی لطف اللہ صاحب، نواب عبدالعزیز خاں صاحب، مولوی سید عزیز الدین صاحب شکارپوری۔ استاد نے سامنے درس بھی دیا۔ مفتی صاحب شاگردوں کی بہاریں دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوتے تھے۔ بالآخر مولوی سید حسین شاہ صاحب کو مدرس اول اور مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس ثانی مقرر فرماکر حج کو روانہ ہوگئے۔ اس زمانہ میں جہاز ہوائی تھے۔ جدہ کے قریب پہنچ کر جہاز پہاڑ سے

ٹکرا کر ڈوب گیا مفتی صاحب بحالتِ نماز احرام باندھے ہوئے غریق د شہید ہوئے ۔ یہ واقعہ، شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے، ۵۲ برس کی عمر ہوئی۔

تصانیف | شرح ہدایۃ الحکمۃ صدر شیرازی، تصدیقات حمداللہ اور شرح جمعنی پر حواشی ۔ اُردو میں بہت سے مفید عام رسالے جن کے نام عموماً بے تکلف تاریخی ہیں ۔ عام مولویوں کی روش کے خلاف ان رسالوں کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے ۔ مضامین عملی اور اخلاقی ہیں ۔ اس زمانہ کی مقبول عام روش مناظرہ سے بچ کر پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا ہے جو دل نشیں ہے، دل پزیر ہے، ہنگامہ آرائی سے پاک ہے ۔ خلاصہ یہ کہ مصری کی ڈلیاں بھڑوں کے چھتے میں نہیں رکھی ہیں ۔ ایک مختصر سا فنڈ جمع کر لیا تھا اس کی مدد سے یہ رسالے طبع ہوتے، تقسیم کئے جاتے ۔ مدرسۂ فیض عام کا قیام اور نشر علم کا یہ طریقہ مفتی صاحب کی دُور اندیشی اور ضرورت کے صحیح اندازہ پر دال ہیں ۔

ایک کتاب ہیئت جدید (فیثا غورسی) پر لکھی تھی، مسمّٰی بہ مواقع النجوم ۔ اس کو ہیئت کے ماہر بعض انگریزوں نے پسند کیا ۔ ایک کتاب عربی میں بے نقط لوامع العلوم و اسرار العلوم کے نام سے لکھی تھی ۔ اس میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا ۔ ہر علم کا نام بے نقط تھا ۔ مثلاً تفسیر علم کلام اللہ، حدیث علم کلام الرسول، فقہ علم الاحکام، علی ہذا القیاس ۔ تمام نہ ہوئی تھی کہ

عمر تمام ہوگئی۔ مسودہ ساتھ غرق ہوگیا۔ مفتی صاحب تمام علوم کا درس پوری قوت سے دیتے تھے۔ ریاضی میں ممتاز تھے، ادب کا ذوق تھا۔ کان پور کے قیام میں روزانہ شام کو میدان میں ہواخوری کے لئے تشریف لے جاتے۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب سے ادبی و علمی ذکر ہوتے جاتے۔ ایک روز کی صحبت یہ تھی کہ مفتی صاحب اردو اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھتے سید صاحب اس کا ہم مضمون فارسی شعر پڑھ دیتے ؎

باز خوانم قصۂ اُستادِ خود

تا در و دیوار را آرم بوجد

ابتداءً مفتی صاحب نے شاگردِ جدید کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد کیا، جس نے صرف نحو پڑھائی۔ ہدایۃ النحو شروع ہوئی تو خود پڑھانا شروع کیا۔ اُستاد کی شفقت اور شاگرد کی محنت نے یہ نتیجہ دکھایا کہ ڈیڑھ سال میں ملا حسن تک پہنچ گئے، ملا حسن کلیات خمسہ تک پڑھا کر فرمایا کہ اب سبقاً سبقاً اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں، خود مطالعہ سے پورا کرلو، جہاں ضرورت ہو دریافت کرلو۔ فرماتے تھے کچھ دن دیکھا دریافت کی ضرورت نہ ہوئی پھر چھوڑ دیا۔ نورالانوار شروع ہوئی۔ دس پندرہ سبق پڑھا کر ارشاد ہوا اب مطالعہ کر کے ہم سبقوں کو پڑھا دیا کرو۔ چنانچہ مطالعہ اور بوقتِ ضرورت استفادہ کر کے ساری کتاب پڑھا دی۔ اُستاد نے خوش ہوکر

اس کی جگہ قاضی مبارک شروع کرائی، اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی۔ جس نسخہ میں پڑھا اس پر منہیات اپنے قلم سے لکھے۔ یہ نسخہ کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ قاضی مبارک کے بعد حمد اللہ کی نوبت آئی۔

صبح کی نماز کے بعد مفتی صاحب تلاوت فرماتے تھے۔ حکم تھا کہ اس وقت حاضر رہیں، دورانِ تلاوت میں مشکل صیغہ آتا تو اُن کی طرف دیکھتے یہ حل کرتے، حل نہ کر سکتے تو بعد تلاوت خود حل کر کے بتاتے۔

تبادلہ کے وقت تک کتابیں ختم نہ ہوئی تھیں۔ لہذا اُستاد کے ساتھ بریلی گئے وہاں جملہ کتب درسیہ کی تحصیل سے فارغ ہوئے۔ بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا سر رشتہ دار مقرر کر لیا۔ اس خدمت پر فائز تھے کہ اُستاد انڈمان بھیج دئیے گئے۔ شاگرد با دل خستہ گھر چلے آئے۔ اس طرح چودہ ۱۴ برس مسلسل اُستاد کی خدمت سے فیض یاب رہے۔

بریلی کا قیام | بریلی میں قیام کس وقار علمی سے رہا تھا اس کو ذیل کے واقعہ سے سمجھ لو گے۔ ۱۳۱۳ھ میں ندوۃ العلماء کا اجلاس بریلی میں ہونے والا تھا۔ مخالفین اور موافقین شکست و فتح کی سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ مولوی صاحب صدارت کے لئے حیدر آباد سے تشریف لانے والے تھے۔ اعلانوں میں، زبانی بیانوں میں جس قدر ندوہ کے متعلق اعتراض ہوتے اسی قدر مولوی صاحب کی ذات ہدف اعتراض ہوتی۔ بالآخر صدر نشین فائز بریلی

ہوئے۔ پرانے شہر کے شرفا جب اعتراض سنتے سنتے تنگ آگئے تو اس تردد میں پڑے کہ آخر یہ مولوی لطف اللہ ہیں کون؟ ایک وہ تھے جو یہاں تھے اگر وہی ہیں تو حیرت ہے کہ ان کے عقائد و حالات ایسے بدل گئے۔ بالآخر ملنے اور زبانی گفتگو کا فیصلہ کیا۔ وہ سماں میری آنکھوں میں آج بھی ایسا ہے گویا کل کی بات ہے کہ مغرب و عشا کے مابین پرانے شہر کے معمر شرفا کی ایک جماعت قیام گاہ میں آئی، ایک دوسرے کو دیکھکر دیرینہ اخلاص و محبت کے اثر سے گرم جوشانہ ملے۔ رسمی گفتگو کے بعد اصل مدعا پر گفتگو ہوئی۔ زبان حق بیان سے ندوۃ العلماء کے مقاصد و احوال سن کر جو اثر سامعین پر ہوا دیدنی تھا نہ شنیدنی۔ متحیر آئے تھے مطمئن اٹھے جاتے ہوئے جو الفاظ زبان پر تھے خدا کرے ان کا اعادہ کبھی نہ ہو۔

کول (علی گڑھ) کا قیام | حاصل کلام، بریلی سے کول آنے کے بعد عسرت اور بے کاری کا زمانہ تھا۔ آخر کایتھوں سے مل کر ایک مکتب جاری کر لیا۔ ان کے لڑکوں کو چھوٹے چھوٹے رسالے پڑھایا کرتے تھے۔ دس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، صاحب عیال تھے، دو بچے ہو چکے تھے۔ سارا کنبہ اسی قلیل تنخواہ میں بسر کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کی نوبت پہنچ جاتی بعض خاندانی واقعات کی وجہ سے جائداد کی آمدنی سے مستفید ہونے کا موقع نہ تھا۔ دو سال کا زمانہ اسی حوصلہ مندی سے بسر کر دیا۔ اس عرصہ میں والد

سخت علیل ہو گئے، تیمار داری اس غم خواری سے کی کہ دوا لینے پیادہ پا پلکھنہ سے کول جاتے اور ہر روزہ واپس آتے۔ ان دونوں مقاموں کے درمیان فاصلہ چودہ میل کا ہے۔

فیض عام کان پور میں درس

بالآخر جیسا کہ تم اوپر سن چکے مفتی عنایت احمد صاحب انڈمان سے واپس آ کر حج کو گئے، اور مولوی صاحب کا تقرر مدرسہ فیض عام کی دوم مدرسی پر ہو گیا۔ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ مولوی سید حسین شاہ صاحب نواب شاہجہاں بیگم کی طلب پر بھوپال چلے گئے، مولوی صاحب مدرس اول ہو گئے۔

ایک لطیفہ مولوی سید حسین شاہ صاحب کے قیام بھوپال کا بے موقع نہ ہو گا۔ سید صاحب کی مراسلت بعض مسائل میں مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب سے ہوئی (اس وقت تک نواب نہ ہوئے تھے)۔ اس میں سید صاحب نے ایک شعر لکھا ؎

برخیز بت شکن کہ بتے چند بشکنیم
در سومنات شور و شر دیگر افگنیم

بعض حریفوں نے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کو یہ کہکر بدظن کرنا چاہا کہ سید صاحب نے دارالاسلام بھوپال کو سومنات کہا۔ سید صاحب نے سنا تو جواب دیا اور لاجواب دیا:

"سومنات ہمان ست کہ دراں سلطان محمود غزنوی شور و شر افگندہ بود
.... بھوپال کہ سلطنتِ مومنات ست دراں چہ جائے
سومنات ست"

خلاصۂ کلام، مولوی صاحب نے سات برس تک مدرسۂ فیض عام میں درس دیا، کس قوت سے یہ بھی سن لو۔ میرے اُستاد مولوی عبدالغنی خاں صاحب مدرسۂ موصوف کے اولین شاگردوں میں تھے۔ مجھ سے بیان فرمایا کہ مدرسہ کے قریب ایک مسجد تھی، اُستاد اور شاگرد صبح کو ایسے وقت وہاں پہنچ جاتے کہ جماعت فجر سے پہلے تفسیر بیضاوی کا سبق ہو جاتا تھا" اس سے فارغ ہو کر باجماعت نماز پڑھتے، نماز سے فارغ ہوتے ہی درس شروع ہو جاتا، دوپہر تک رہتا، اس کے بعد وقفہ اس قدر کہ کھانے اور کچھ آرام کے بعد ظہر باجماعت ادا ہوتی، نماز کے بعد درس، عصر کے بعد پھر درس، مغرب کے وقت ختم، کبھی ایک آدھ سبق بعد مغرب بھی ہو جاتا۔

درس میں اتنا انہماک تھا کہ وطن کا آنا جانا شدید ضرورت ہی سے ہوتا وہ بھی جریدہ تاکہ زیادہ قیام نہ کرنا پڑے۔

جامع مسجد علی گڑھ میں درس

کان پور میں سات برس رہنے کے بعد مرکز اصلی کی جانب رجوع فرمایا۔ علی گڑھ کے مدرسۂ جامع مسجد میں اوّل مدرسی پر تقرر ہوا۔ پچاس روپیہ تنخواہ ٹھیری۔ صورت یہ

ہوئی کہ مولوی صاحب کے شاگرد خواجہ محمد یوسف مرحوم وکیل نے مدرسۂ مذکور کو از سر نو جاری کیا۔ اُستاد کو کان پور سے بُلا کر مدرس اول مقرر کیا، خواجہ صاحب تعلیم قدیم و جدید دونوں کے دل دادہ تھے۔ ٹرسٹیز بل کے خرخشہ میں آنے تک سر سید مرحوم کے ساتھ اور محمڈن کالج کے سرگرم معاونین میں تھے۔ مدرسہ کے مصارف کا بڑا جز چھتاری اور بھیکن پور کی ریاستوں سے ادا ہوتا تھا۔ کیسی نیک کمائیاں تھیں جو ہند سے بخارا تک فیض پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ مدرسہ کی رونق اور طلبا کا ہجوم قابل دید تھا۔ مولوی صاحب دوپہر کا کھانا مسجد ہی میں تناول فرماتے۔ صبح سے آ کر عشا کے وقت دولت خانے جاتے۔

آج پریڈ (PERIOD) گننے والے ان باتوں کو کیا سمجھیں گے۔ نہ سمجھیں تو واقعہ تو واقعہ ہی رہے گا۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے بڑے بڑے علما اسی زمانے میں فیض یاب ہوئے۔ پہلی فارغ ہونے والی جماعت میں (جو کان پور سے ساتھ آئی تھی) مولوی سید محمد علی صاحب، مولوی عبد الغنی خاں صاحب، مولوی احمد حسن صاحب، مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبد الحق صاحب دہلوی صاحب تفسیر حقانی اور مولوی سیّد محمد اسحٰق صاحب پٹیالوی شامل تھے۔ دیکھو! ان میں سے ہر ایک کس شان علمی میں جلوہ فرما ہوا۔ ثانی الذکر بعد فراغ استاد کی جگہ کان پور میں

مدرسۂ فیضِ عام کے مدرس اوّل مقرر ہوئے۔ ایک خط میرے پاس محفوظ ہے جس میں مولوی عبدالحی صاحب مرحوم فرنگی محلی نے آخرالذکر موصوف کی قوّتِ تدریس کی مدح و ثنا لکھی ہے۔

ذرا یہ بھی سُن لو کہ یہ علما کس طرح پیدا ہوئے۔ میرے اُستاد نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک بار میرزا دبیر مرحوم لکھنؤ سے کانپور آئے ان کی آمد نے کانپور میں ایک غلغلہ ڈال دیا۔ مولوی صاحب نے شاگردوں کو اجازت دی بلکہ شوق دلایا کہ مرزا صاحب کو دیکھیں، ان کا پڑھنا سُنیں، پھر یہ موقع کہاں ملے گا، فرماتے تھے مجھکو سبقوں سے مہلت ہی نہ دی گئی جاتا، نہ دیکھنے کا اب تک افسوس ہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ علی گڑھ میں طَلَبہ کے رہنے کی جگہ جامع مسجد کے حجرے تھے۔ دو مجبوب حجرے اور بھی تھے۔ جامع مسجد کے عالی شان میناروں میں زینہ کی گھوم سے درمیان میں جو وسعت پیدا ہوگئی ہے وہ بھی حجرے کا کام دیتی۔ شائق طَلَبہ ان کی فکر میں رہتے، خالی ہونے سے پہلے درخواستیں گزر جاتیں۔ فرماتے تھے کہ ایک بار اُن میں سے ایک حجرہ مجھکو بھی مل گیا تھا، نیچے کا دروازہ بند کر کے مطالعہ کو بیٹھ جاتا تو دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہتی۔ مطالعہ کا جو لطف وہاں آیا کہیں نہ ملا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ درس سے فارغ ہو کر پہلی فکر یہی ہوتی کہ اُستاد کی تقریر

دل میں ایسی نقش ہو کہ کبھی نہ بھولے، راستہ اس کی ذہنی تکرار میں صرف ہوتا، مکان پر پہنچ کر فوراً قلمبند کی جاتی، اس عرصے میں دوسرے ہم سبق آجاتے اُن سے تکرار کی جاتی، ہر ایک اپنی اپنی یاد سے اعادہ کرتا، اتنی کاوش کے بعد جب تقریر ذہن نشین ہو لیتی تو چین سے بیٹھتے، ضروریات کی جانب توجہ کرتے۔

یہ بافیض درس ۱۲۸۵ھ سے لغایت ۱۳۱۲ھ ستائیس برس مسلسل حیدر آباد کے تعلق تک جاری رہا۔ اُستادوں نے پڑھا، باپوں نے پڑھا، شاگردوں کے شاگرد اور بیٹے بھی فیض یاب ہوئے۔ عجب اتفاق ہے سب سے پہلے دور میں میرے مکرم اُستاد مولوی عبدالغنی خاں صاحب نے پڑھا تھا۔ سب سے آخر کے باقاعدہ دور میں ننگِ تلامذہ راقم شرر داخل شامل تھا۔ اس درس میں میرے ہم سبق مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم، مولوی سید عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ، مولوی محمد ہاشم مرحوم سنبھلی، مولوی صدیق حسین حال مدرس مدرسہ جامع مسجد، مولوی اطہر حسین مرحوم بہاری تھے۔ سوائے عاجز کے سب کے سب عالم اور علم کے خادم بنے۔

جامع مسجد کے دورِ درس میں یہ چشمہ اُس سہ دری سے جوش زن تھا جو جنوبی منارے کے متصل ہے۔ مولوی عبدالقدوس صاحب پنجابی

مسجد کے اندر درس دیتے، حافظ رحیم بخش مرحوم قرآن شریف حفظ کراتے۔ ایک دوسرے مولوی عبدالقدوس فارسی پڑھاتے۔ طلبہ کی کثرت تھی۔ جامع مسجد میں نماز کی جماعتیں بڑی شان سے ہوتی تھیں، شہر کی دوسری مسجدیں بھی طلبہ سے آباد تھیں۔

یہ یادگارِ زمانہ درس اس شان سے جاری تھا کہ اس کو صدمہ پہنچا۔ اس عہد میں تقلید و عدم تقلید کے جو ہنگامے ملک میں برپا تھے ایک بیچارہ کول بھی ان کی زد میں آگیا۔ معرکے گرم ہوئے، مخالفت کے طوفان اُٹھے۔ مولوی صاحب نے جامع مسجد میں درس موقوف فرما دیا۔ مکان کے قریب ایک چھوٹا کمرہ کرایہ پر لے کر اس میں پڑھاتے تھے، میں وہیں حاضر ہوا۔ ایک شکستہ بوریئے پر نشست ہوتی، دل میں اب تک اس عزت کی یاد ہے۔ کاش پھر نصیب ہوتی۔ طوفان بے تمیزی کا انجام یہ ہوا کہ مولوی صاحب کو زہر دیا گیا۔

زہر خورانی

۲۳ محرم الحرام ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۸۹۴ء کو ایک خط مولوی صاحب کی خدمت میں آیا۔ لکھا تھا کہ "میں آپ کا شاگرد ہوں تلاش معاش میں سرگرداں تھا، ماں نے منت مانی تھی کہ نوکری لگنے پر پہلی تنخواہ سے مولود شریف کی مجلس کریں گی، چنانچہ ملازمت مل جانے پر مجلس کی گئی۔ شیرینی آپ کی خدمت میں بھی بھیجتا ہوں۔" دوسرے روز

ایک شاگرد اسٹیشن جاکر پارسل لے آئے، اندر بھیج دیا، کھولا تو ٹکیٹی کے بڑے بڑے لڈو نکلے۔ ان میں سپید سپید مصری کے دانے بکثرت چمک رہے تھے۔ تبرک کے خیال سے پارسل کے کھلتے ہی آدھا لڈو مولوی صاحب نے کھالیا، اتفاقاً کوئی اور عزیز اس وقت پاس نہ تھا ورنہ حسب عادت اوّل اس کو کھلاتے۔

تھوڑی دیر میں قلب پر گھبراہٹ محسوس ہوئی، استفراغ ہوا۔ بی بی صاحبہ کو بلاکر ماجرا کہا۔ اُنھوں نے فوراً منجھلے صاحبزادہ مولوی عنایت اللہ صاحب کو طلب کیا، جو درس چھوڑ کر فوراً حاضر ہوئے۔ یہ طبیب بھی تھے۔ دیکھا کہ استفراغ جاری تھا، گھبرا کر سبب پوچھا تو پارسل کے آنے اور لڈو کھانے کا واقعہ معلوم ہوا۔ لڈو دیکھے تو معلوم ہوا کہ مصری نہ تھی، سنکھیا سے بھرے ہوئے تھے، بہرحال یونانی اور ڈاکٹری ممکنہ تدابیر کی گئیں، طبیب اور ڈاکٹر برابر حاضر رہے۔ شہر میں ایک تلاطم تھا، شب کو حالت زیادہ نازک ہو گئی جس سے معالج بھی گھبرا گئے۔

قصّہ مختصر فضل الٰہی شامل حال تھا کہ اس سخت مہلکے سے نجات ملی۔ ۱۱ر ستمبر کو غسل صحت ہوا۔ اہل شہر نے اظہارِ مسرت و شکر اس طرح کیا کہ چندہ کر کے جامع مسجد میں شب کو مجلس میلاد مبارک منعقد کی، روشنی

کی گئی، صبح کو شیرینی تقسیم ہوئی۔

پولس نے مجرم کی تلاش کی پتا نہ چلا۔ مولوی صاحب نے کسی پر شبہ ظاہر نہیں فرمایا۔

اس پر ہمیشہ شکر فرماتے تھے کہ پارسل کھلنے کے وقت کوئی عزیز پاس نہ تھا، ورنہ وہ بھی شیرینی سے مسموم ہو جاتا۔ مہربانِ نامہرباں نے تو اپنے زعم باطل میں سارے گھر کے خاتمے کا سامان کر دیا تھا مگر ؏

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

اس حادثے نے علمی مصیبت کی شکل یہ اختیار کی کہ مولوی صاحب کا دل علی گڑھ سے بیزار ہو گیا، درس کی جانب رغبت نہ رہی، طلبہ کی خاطر سے بادل ناخواستہ پڑھاتے تھے، اس پر بھی ناغہ بہت ہوتا۔

دستِ قدرت نے جلد علی گڑھ کے ساکنین کو یہ دکھا دیا کہ اب وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ علم و فضل کا ایسا سرمایہ دار اُن میں رہتا۔

تعلق حیدر آباد | غفران منزل آصف جاہ سادس کی فرمانروائی اور سر وقار الامراء مرحوم کی مدار المہامی کا دور تھا۔ مدار المہام کو مسلمانوں کی مذہبی تباہ حالی کا احساس ہوا، یہ ارادہ کیا کہ کوئی بلند پایہ عالم شمالی ہند سے طلب کر کے خدمت اصلاح سپرد کریں۔ اتفاق وقت مولوی صاحب کے ایک بنگالی طالب علم اس زمانے میں فراج میں در خور تھے۔ قدرۃً

انھوں نے اپنے اُستاد کے تقرر کی تجویز پیش کی۔ مدار المہام نے منظور کی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں (یعنی زہر خورانی کے تین مہینے بعد ہی) حیدرآباد سے مراسلہ آیا کہ یہ تقرر منظور ہو تو سفر خرچ بھیجا جائے، یہاں سے منظوری گئی، وہاں سے زادِ راہ آگیا۔

مشاہرہ سات سو روپیہ ماہوار، خدمت صدارت المدرسین۔

۲۸ر فروری ۱۸۹۵ء کو بعد نماز جمعہ اہل شہر سے رخصت ہو کر حیدرآباد روانہ ہوئے۔ منجھلے فرزند مولوی عنایت اللہ صاحب کو اپنی جگہ جامع مسجد میں صدر مدرس مقرر کیا۔

تین نامور شاگرد مولوی سید محمد علی صاحب، مولوی عبد الغنی خاں صاحب اور مولوی عبد الجمیل صاحب افغانی اور چھوٹے صاحبزادہ میاں عبد الحمید ہمراہ تھے۔ حیدرآباد پہنچنے پر شایستہ استقبال ہوا، مہمان خانۂ ریاست میں قیام۔

قضائے الٰہی اسی عرصے میں مفتی عدالت مفتی محمد سعید صاحب مرحوم نے (جو مدراس کے علمی خاندان کے سرمایۂ سعادت تھے) انتقال فرمایا۔ قدرت نے مولوی صاحب کو بجائے خدمت صدر المدرسین کے اس عہدے کے لئے نامزد کیا تھا۔ چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر ۱۲ر مارچ ۱۸۹۵ء کو عہدۂ مذکور پر تقرر ہو گیا۔

ممالک محروسۂ سرکار عالی میں اب تک مطابق شرع قصاص کا طریقہ جاری ہے۔ پھانسی نہیں ہے، قصاص کے لئے حضور نظام کی منظوری بحیثیت فرماں روائے اسلام ضروری ہے۔ حضور اُس وقت منظور فرماتے ہیں کہ مفتی شرع فتوی دیں۔ اس خدمت کے لئے عہدۂ افتاء مجلس عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) میں قائم ہے۔ ضرورت کے وقت مفتی اجلاس میں بیٹھکر ججوں کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں۔

نواب وقار الامراء بڑے سیر چشم عالی حوصلہ امیر تھے، عمارت کا ایسا سلیقہ تھا کہ انجنیروں کو بھی کم حاصل ہوا ہوگا۔ قصر فلک نما ان کے ذوقِ تعمیر کی نادر شہادت ہے۔

مفتی صاحب کی (اب ہم مولوی صاحب کو مفتی صاحب کے لقب سے یاد کرتے ہیں) تعظیم و بزرگداشت ہمیشہ ملحوظ رکھتے، اطلاع ہونے پر فوراً یاد فرماتے، تعظیم کو کھڑے ہو جاتے، بعض اوقات کرسی اپنے ہاتھ سے بچھاتے۔

چند سال یہ خدمت انجام دی تھی کہ قویٰ کے ضعیف ہونے پر اثر سمیت نے پھر قوت دکھائی۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں دفعۃً دردِ سر شدید لاحق ہوا۔ صاحبزادہ مولوی امانت اللہ صاحب نے اپنے منجھلے بھائی مولوی عنایت اللہ صاحب کو بلایا (جو طبیب بھی تھے)

انھوں نے سببِ مرض بس سمیّت تجویز کرکے معالجہ کیا، چنانچہ روغن کاہو اور روغن بادام سرکہ میں ممزوج کرکے بدفعات ڈھائی سیر سر پر ملا گیا تب افاقہ ہوا۔ خارجی تدبیر اس وقت تو مؤثر ہو گئی، مگر پھر دوسرا فساد نمایاں ہوا، تمام جسم پر آبلے نمودار ہو کر پھوٹے اور سارا جسم زخم بن گیا۔

ع دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

بالآخر رخصت علالت لے کر دلّی تشریف لائے، معالجہ کارگر نہ ہوا، مزید رخصت حاصل کی گئی۔ افاقہ ہوا تو دکن کو مراجعت کی، زحمتِ امراض باقی تھی، دردِ سر شدید مزید براں۔ بے تکلف علی حزیں کا شعر صادق تھا

چہ شد یارب کہ امشب در دِ سر تسکیں نمی یابد
زبے تابی سرم می گردد و بالیں نمی یابد

مولوی عنایت اللہ صاحب بھوپال سے پھر طلب ہوئے، ان کی تدبیر سے دردِ سر رفع ہو گیا، باقی امراض کا علاج لوکا بابو ایک مدراسی وید نے بڑے معرکے سے کیا، دو مہینے سے زیادہ معالجہ جاری رہا، پوری صحت ہو گئی۔ اب تیسرا مرض ضعف پیری نمودار ہوا، آنکھوں کی بینائی سرعت سے کم ہونے لگی اس عالم میں ایک خط مولوی عنایت اللہ صاحب کو لکھا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان آنکھوں سے اگر بیت اللہ اور روضۂ اقدس کو نہ دیکھا تو

وائے برمن ووائے برناکامی من، خیر رضینا بما قضا اللہ علینا"۔

مراجعتِ وطن | چھ سات مہینے میں روشنی بالکل جاتی رہی، روشنی کے ساتھ تعلق ریاست بھی گیا۔ علی گڑھ تشریف لائے، ڈاکٹروں نے پانی پختہ ہونے کے لئے دو ڈھائی سال کی مدت معین کی، چنانچہ یہ زمانہ صبر و رضا سے بسر فرمایا۔

۱۳ مارچ ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ کے مشہور معالجِ چشم ڈاکٹر اینڈرسن نے بڑی توجہ اور بزرگ داشت سے کامیاب قدح کیا۔ ڈاکٹر کی رائے تھی کہ ایک آنکھ کا آپریشن ہو دوسری دوسرے وقت کے لئے محفوظ رہے۔ ادھر سے اصرار ہوا کہ دونوں آنکھ کا آپریشن کردیا جائے۔ حسرت اس پر ہے کہ آپریشن کے بعد ضروری احتیاط نہ کی گئی۔ حرکت کرنا، آواز سے بات کرنا، پانی سے چہرہ کو دھونا وغیرہ ذلک امور ممنوع تھے۔ باوجود معالج کی تاکید و توجہ کے کسی کی پابندی نہ ہوسکی۔ نتیجہ یہ کہ دونوں آنکھیں خراب ہوگئیں، ایک کا ڈھیلا بہہ گیا، دوسری خراب ہوکر رہ گئی۔

آنکھوں کے جانے کا جو صدمہ ہوا ہوگا ظاہر ہے، معذوری نے چلنا پھرنا چھڑا دیا، اس کا اثر عام صحت پر خراب پڑا، مالی دقتیں بھی پریشان کرتی رہیں۔ مجھکو اس زمانے میں حاضری کا مسلسل موقع حاصل

ہوتا رہا۔ باوجود معذوری و پریشانی کے رکھ رکھاؤ کا اہتمام پورا تھا، ہمیشہ صابر و راضی برضا دیکھا، لباس وغیرہ صاف مرتّب۔

سننے کے لائق یہ بات ہی کہ مرض، عدم بصارت، مالی دقّت ان میں سے ہر مصیبت سوہانِ روح تھی۔ ہمت و استقلال دیکھو درس اس حالت میں بھی جاری تھا۔ مولوی بدرالدین اور مولوی کرم الٰہی اسی زمانے کے تلامذہ میں ہیں۔ زیادہ توجہ درس حدیث و تفسیر پر تھی غایت شوق فرماتے تھے "میاں بدرالدین جب پڑھنے آجاتے ہیں تو میں اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہوں اور جب تک ان کو پڑھاتا رہتا ہوں ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہی"

اسی زمانے کا ایک واقعہ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان فرمایا۔ اپنے علی گڑھ آنے کے تیسرے ہی دن سلام کو حاضر ہوئے ایک روز پہلے جامع مسجد میں بیان ہو چکا تھا، حاضری پر مخصوص خاندانی طریقے سے قدم لئے۔ مولوی صاحب اس وقت آرام کرسی پر آرام فرما تھے، بغیر تعارف صاف الفاظ میں فرمایا "مولوی سلیمان اشرف" اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

گر تو تعظیم خواہی از منِ زار
بہرِ تعظیم خود مرا بردار

دوسرا واقعہ صاحبزادہ مولوی امانت اللہ صاحب کی زبانی۔
شرح چغمینی کے پڑھانے میں ایک دائرہ کے متعلق اشکال پیش آیا۔ حاضر خدمت ہو کر مشکل پیش کی۔ فرمایا "امانت اللہ! اب دماغ کہاں رہا۔ خیر ایک لوٹا مٹّی کا لے لو" لوٹا لایا گیا۔ ایک ہاتھ پر اُلٹا کر کے کرہ بنالیا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی کو کردی حرکت دی۔ صاحبزادہ کا بیان ہے کہ اُنگلی کا حرکت کرنا اور مسئلے کا سمجھ میں آجانا گویا ایک ہی بات تھی۔

تیسرے واقعے کا مولوی معین الدین صاحب اجمیری نے ذکر کیا۔
میر زاہد کی ایک تقریر باوجود مکرر غور کے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حاضری کے وقت اشکال پیش کیا، سنتے ہی فرمایا کہ اس مسئلے کے متعلق اوپر کے مقدمات کی تقریر میں فلاں غلطی ہوئی ہے، اس کی تقریر اس طرح کر دحل ہو جائے گا۔ چنانچہ تقریر زاہدی کا مضمون صاف ہوگیا۔

وفات | ۱۳۳۴ھ میں عرفے کے دن مطابق ۸ر اکتوبر ۱۹۱۶ء تین اور چار بجے سہ پہر کے درمیان بمقام کول (علی گڑھ) انتقال فرمایا۔ یہ وہ دن تھا کہ میدانِ عرفات اہل ایمان کی لبیک سے گونج رہا تھا۔ نوّے برس کی عمر ہوئی۔ حضرت شاہ جمال العارفینؒ کے جوار میں آسودہ ہیں۔ چند قدم کے فاصلہ پر شاگرد رشید مولوی عبدالغنی خاں صاحب

مدفون ہوئے تاریخ وفات از حسرت شروانی "استاذالعلما" ۱۳۳۴ھ

حلیہ | بلند بالا - بدن دوہرا، رنگ سرخ سپید، سینہ چوڑا، پیشانی وسیع، آنکھیں بڑی روشن، ناک دراز بھاری، ہونٹ باریک، دہانہ چھوٹا، گردن لانبی، ڈاڑھی سپید نورانی، ہنس مکھ چہرہ۔ زہر کے اثر سے پہلے قویٰ اعلیٰ درجہ کے تھے، صحت بہت اچھی تھی۔ سردی گرمی اور محنت کے اثر سے بالاتر۔

لباس | انگرکھا، کرتا، عرض کا پاجامہ، سرپر اکثر دوپلی ٹوپی، خاص اوقات میں منشیانہ طرز کا عمامہ سرپر، اس پر سے سپید چادر۔ مردانہ میں ہمیشہ پورے لباس میں نمودار ہوتے۔ صرف کرتے میں کبھی برآمد نہ ہوتے، کرتا جسم سے گرمی میں یا تخلیہ میں بھی جدا نہ ہوتا۔ لباس کی درستی اور صفائی کا پورا اہتمام رہتا۔ میں نے مرض اور نابینائی کی حالت میں بھی لباس میلا یا فرسودہ نہیں دیکھا۔

عادات | نشست برخاست اور گفتگو میں تہذیب ووقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے۔ خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادات تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدّتِ گرما میں سرپہ چادر رکھ کر دھوپ میں چلے جاتے۔ اس سلسلے میں ایک جاں پرور واقعہ سن لو۔

گرمی کے سخت موسم میں ایک بار مدرسۂ عالیہ کا امتحان لینے رام پور تشریف لے گئے۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے۔ حسب عادت سر پر چادر رکھکر پیادہ پا اُستاذ العلما مولوی محمد ہدایت اللہ خاں صاحب صدر مدرس مدرسۂ جون پور کے مکان پر جا پہنچے۔ مولوی صاحب قیلولے کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے۔ اوّل ایک پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پزیرائی فرمائی۔

شان پزیرائی غور سے سنو۔ اب یہ واقعے کہاں، دیکھنا درکنار سنو گے بھی نہیں۔ اپنے بھتیجے حافظ اسعد اللہ خاں کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈالوایا۔ اپنے ہاتھ سے دھوئے سقاہ اللہ تعالیٰ کاسًا دھاقًا۔

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے۔ رام پوری فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو یوں کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا ایسی دھوپ میں تکلیف فرمائی اور وہ بھی پیادہ پا، اپنی خدمت کا تذکرہ درکنار اشارہ بھی نہ کیا۔ ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکرگزاری کا ذکر کیا تو فرمایا کہ میں نے کیا کرم کیا مجھکو تو دوپہر کہیں بسر کرنی تھی وہیں چلا گیا، کرم تو

مولوی صاحب نے فرمایا۔ یہ کہکر پانی منگوانے اور پاؤں دُھلانے کا واقعہ بیان فرمایا۔ دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے نہیں دریا بہے، رحمہا اللہ تعالیٰ۔

آمدم بر سرِ مطلب، مزاج شگفتہ تھا، بامذاق تھا، تکلف سے بَری تھے خاص صحبتوں میں مزاح بھی فرماتے، شعر کا ذوق پورا تھا، خاص صحبتوں میں اشعار کا ذکر چھڑ جاتا تو گھڑیوں جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے۔ عربی، فارسی، اردو ادب سے یکساں ذوق تھا۔ مجھکو یاد ہے کہ ایک صحبت میں "ہوشم" اور "دوشم" کے قافیہ پر بہت سے مطلعے استادوں کے پڑھے تھے۔ تین مطلعے اب تک یاد ہیں:

صائبؔ

نمی دانم کرا دیدم کہ از خود می رود ہوشم
جنوں آہستہ می گوید مبارک باد در گوشم

لا ادری ؎

بیک پیمانہ ساقی کرد مدہوش آں چناں دوشم
کہ از محفل حریفاں چوں سبو بردند بر دوشم

مولوی فیض الحسن سہارن پوری ؎

صلا زدم کہ من آزادۂ نمد پوشم غلامِ حیدرم و جامِ حیدری نوشم

"جام حیدری" کی تعریف فرمائی۔

گفتگو ہر شخص سے علیٰ قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کر کے محظوظ ہوتا۔ تعلّی یا ادّعا کا شائبہ بھی کلام میں نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی۔ تلاوت کلام مجید بھی تخلیے میں فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصّے میں بھی زبان سے نہ نکلتے۔ ملازموں کے لئے انتہائی غصّے کے الفاظ یہ تھے "تم بچپا کے باوا ہو" یا "لائق ہو" (گویا "نالائق" کا نعم البدل ہے)۔

سیر چشم اور فیاض تھے، اسی لئے اکثر قرض کا بار رہتا۔ حیدرآباد کے تعلق کے زمانے میں ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ بدقّت کفایت کرتی۔ شادیوں میں دعوتیں بڑے حوصلے سے ہوتیں، جن کو رؤسا بھی مان جاتے۔ شادی کی تقریبوں میں تلامذہ کا اجتماع قابل دید ہوتا، جن میں بڑے بڑے علما ہوتے، سب کے سب مہمانوں کی خدمت بے تکلف کرتے۔ مولوی ہی پلنگ بچھاتے، دوسرا سامان آسائش مہیا کرتے۔ ایک تقریب میں میری قیام گاہ میں مولوی ظہور الاسلام صاحب فتح پوری مرحوم سامان لائے تو میں نے معذرت کی اور کہا کہ آپ تکلیف نہ کریں، ہنس کر فرمایا یہاں مولویوں کے سوا ہے کون جو تمھارا کام کرے گا۔

ایک تقریب میں شام کے وقت میں نے دیکھا کہ متعدد چارپائیوں پر تلامذہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مولوی سید محمد علی صاحب، مولوی عبدالغنی خاں صاحب، مولوی احمد حسن صاحب، مولوی عبدالجمیل صاحب افغانی (صدر مدرس ویلور، مدراس) مولوی سیّد ظہور الاسلام صاحب وغیرہم تھے۔ آج ان کی نظیر سارے ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ ایک کایستھ شاگرد بھی تھے جن سے برادرانہ برتاؤ ہورہا تھا۔

ضروری واقعات سے باخبر رہنا اور حسب موقع ان میں حصّہ لینا داخلِ اخلاق تھا۔ جو خلاصے جنتریوں کے میرے سامنے ہیں وہ اس کے شاہد ہیں۔ ایک اندراج میرا سرمایۂ نازش ہے: "۳/ مارچ ۱۸۹۱ء حبیب الرحمٰن خاں نے پڑھنا شروع کیا"۔

علمائے معاصرین کے علم و فضل کا اعتراف شامل وضع تھا۔ سب کے ساتھ محبت تھی۔ ان کی وفات سے سخت متاثر و متاسف ہوتے۔ اندراجوں میں مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی، مولوی فیض الحسن صاحب سہارن پوری، مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری وغیرہم کی وفات کا صدمہ صاف عیاں ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مولوی اسمٰعیل صاحب اسرائیلی سے حالانکہ بے لطفی رہتی تھی، مگر دلّی سے جب ان کی وفات کی خبر آئی تو بے اختیار آنکھوں سے

آنسو جاری تھے اور فرماتے تھے "مولوی اسمٰعیل اپنی ذات سے بہت اچھے آدمی تھے"۔

بازار کے چٹ پٹے کباب بہت مرغوب تھے۔ فرمایش ہوتی کہ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کباب گرما گرم آئیں۔ عزیز شاگرد اہتمام کر کے لاتے اور دعائیں لیتے۔ حالتِ علالت میں یہ شوق معالج اور تیمارداروں کے لئے مصیبت ہو جاتا۔ باورچی خانہ میں عمدہ سیخ کے کباب تیار کرائے جاتے، پسند نہ ہوتے۔

درس | مفتی صاحب کا مخصوص کمال درس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عمر دراز بخشی، صحت و قوّت وافر عطا فرمائی، علم کی دولت سے مالا مال فرمایا۔ یہ سارا سرمایہ تدریس و تعلیم میں صرف فرما دیا۔ معتبر شہادت اس کی موجود ہے کہ شباب تدریس کے وقت میں بیس بیس سبق روزانہ پڑھائے۔ مولوی فضل حق صاحب مرحوم خیرآبادی کا ایک خط میرے پاس ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ آج کل درس قوّت سے جاری ہے۔ سولہ سبق روزانہ پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ قیام الور کا واقعہ تھا۔ علی گڑھ میں درس کا سلسلہ ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک ستائیس سال جاری رہا۔ اس سے پہلے سات برس فیض عام کان پور میں درس دیا جا چکا تھا۔ اس طرح چونتیس ۳۴ برس پوری قوّت کے ساتھ مجلسِ تدریس

گرم رہی۔ برسوں یہ معمول رہا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر جامع مسجد میں تدریس شروع فرما دیتے۔ دوپہر کا کھانا وہیں آجاتا، عشا پڑھکر مسجد سے مکان تشریف لے جاتے۔

طلبہ کو مطالعے کی تاکید رہتی، اگر کسی طالب علم کی خامی ثابت ہوتی اس کا سبق ناغہ کر دیا جاتا۔ فرماتے کل مطالعہ دیکھکر پڑھنا۔ یہ فرمائش تلخی یا سختی سے نہ ہوتی بلکہ نرمی سے یوں فرماتے "آج شاید مطالعہ نہیں کیا جو مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کل مطالعہ دیکھکر پڑھنا"۔ یہ روک ٹوک کا سلسلہ خوبی سے ہمیشہ جاری رہتا۔ منجھلے فرزند مولوی عنایت اللہ صاحب درس دے کر بھوپال میں مفتی مقرر ہو چکے ہیں، اس زمانے میں ایک خط میں "مصئون" (بر وزن مسئول) قلم سے نکلا مفتی صاحب نے لکھا کہ "مصون بر وزن مقول ہے ہمزہ کیوں لکھا"۔

ایک اور والا نامے میں فرماتے ہیں (خلاصۃً) عنایت اللہ! اپنی تعظیم میں نہیں چاہتا تمھاری تحریر کی شائستگی کے خیال سے لکھتا ہوں کہ بڑوں کے خط میں آخر والسلام کے ساتھ کوئی لفظ تعظیمی لکھ دیا کرو مثلاً "بالاکرام" برابر والوں کو مثلاً "ختم الکلام"۔

قاضی حسام الدین کشمیری سات برس حاضر درس رہے، اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ اس عرصہ دراز میں صرف دو یا تین بار

طلبہ کی کج بحثی پر مولوی صاحب کو غصّہ آتے میں نے دیکھا، اسی کے ساتھ دوسرے وقت شفقت سے اس کو مطلب سمجھا دیا۔

تدریس کے وقت وقار و تمکین کے ساتھ نشست فرماتے، گھٹنوں برابر ایک پہلو سے بیٹھے رہتے، کتاب ہمیشہ ہاتھ میں کھلی رہتی جماعت میں باری باری سے ایک طالب علم قاری ہوتا، باقی سامع۔ الحمدللہ مجھکو بھی بارہا قاری ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ قاری عبارت پڑھکر ترجمہ کرتا، اس کے خاموش ہونے پر تقریر فرماتے۔ تقریر صاف سلیس اور بسیط ہوتی، طویل نہیں۔ لہجے سے شفقت اور فیض رسانی کا لطف محسوس ہوتا۔ مستعد طلبہ کے لئے پہلی تقریر کافی ہوتی جو نہ سمجھتے ان کے لئے دوبارہ سہ بارہ تقریر فرماتے۔ بشاشت میں فرق نہ آتا۔ اعتراضوں کا جواب نرمی اور تحمل سے دیا جاتا، تمام مراحل طے ہونے پر طلبہ سے دریافت فرماتے "سب نے مطلب سمجھ لیا؟" جواب اثبات میں سن کر آگے پڑھنے کا حکم ہوتا۔ خوبی تقریر اپنے درس میں میں نے یہ دیکھی کہ قاضی مبارک، حمداللہ، میرزاہد رسالہ اور غلام یحییٰ کے دقیق مطالب پانی ہوکر رواں ہوتے تھے۔ حالت درس میں کوئی خاص ملنے والے آجاتے تو درس بند کر کے ان کی جانب متوجہ ہوجاتے۔ ایک بار مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی تشریف لے آئے۔

حسب عادت درس بند کرکے سرو قد ہوکر پزیرائی فرمائی۔ مزاج پرسی وغیرہ رسمی مراتب گفتگو کے بعد فاضل خیرآبادی نے فرمایا کہ طلبہ کا وقت بہت عزیز ہے۔ حرج نہ فرمائیے۔ قاضی مبارک کا درس ہونے لگا۔ خیرآبادی مولوی صاحب سنتے رہے۔ ختم ہونے پر طلبہ سے کہا کہ تمھارے اُستاد کی تقریر ایسی ہے کہ اعتراض خود بخود دفع ہوتے جاتے ہیں۔ جب کوئی معرکے کا مسئلہ آنے والا ہوتا تو طلبہ سے فرما دیتے کہ مطالعہ اہتمام سے کرنا، کل فلاں مشکل مسئلے پر گفتگو ہوگی۔ دوسرے روز تقریر ہوتی تو خود اشکال مشکل ہیں پڑ جاتا، مسئلے کی صاف واضح صورت ذہن میں آجاتی۔ ایسے موقعے پر دوسرے اساتذہ کی تقریریں بھی بیان فرماتے مگر ان پر جرح قدح نہ فرماتے، طلبہ کو خود اندازہ ہوجاتا کہ کون سی تقریر کس پایے کی ہے۔ قاضی سعدالدین مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ان کے درس کے زمانے میں صحیح بخاری کا نسخہ کھلا ہوا سیدھے ہاتھ میں پڑھانے کے پورے وقت تک رہتا۔ یہ وقت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہ ہوتا۔

حالت درس میں بھی شگفتگی اور تواضع کا جلوہ نظر آتا۔

درس کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم یکساں قوت سے پڑھاتے تھے۔ ریاضی کے درس کا تفوق مسلم تھا۔ مطالعے سے ہیئت جدید کے

مسائل پر بھی پورا عبور حاصل فرمالیا تھا۔ متعدد نقشے سیّاروں کی تقویم کے (جدید نظام کے مطابق) یادداشتوں میں موجود ہیں، فرماتے تھے قدرت کی وسعت جدید علم ہیئت میں پائی جاتی ہے، قدیم ہیئت نے تو تمام کائنات کو نو دس کروں میں بند کر دیا ہے۔

بڑی اور چھوٹی کتابیں ایک ہی توجہ سے پڑھائی جاتیں ایک بار لڑکپن میں اپنے عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم کے ساتھ ایک بار چند روز علی گڑھ رہا تھا، حرج سبق کے لحاظ سے ممدوح نے فرمائش کی کہ کوئی طالب علم سبق پڑھانے پر مقرر کر دیئے جائیں، زہے قسمت کہ حضرت نے خود تکلیف فرمائی، بعد مغرب تشریف لاکر سبق پڑھا دیتے، اس وقت میں بدیع المیزان پڑھتا تھا، پہلے روز دیباچہ پڑھوا کر سنا۔ میں نے مؤلف کی نسبت "تلبنی"، "تلبنی بروزن زینبی" پڑھی۔ فرمایا "تلنب بروزن سرنگ، نسبت اس کی طرف تِلِنّبِی"۔ اس واقعہ کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا۔ اس لفظ کے ادا فرمانے کی آواز آج گویا کانوں میں گونج رہی ہے اور لفظ تلنبی کو دونوں لب ملا کر ادا فرمانا گویا اس وقت آنکھیں دیکھتی ہیں۔ یہ تھا سمجھانے کا دل نشیں انداز۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

درس کی ہر فنی قوّت کا اندازہ ذیل کے دو واقعوں سے کرد-

یہ دونوں واقعے مولوی سید عبد اللطیف صاحب میرے ہم درس نے بیان کئے ہیں۔

ایک مولوی سید محمد علی صاحب مرحوم کان پوری کی زبانی۔ مولوی صاحب صحاح ستہ کا دور علی گڑھ میں ختم کر کے سہارن پور مولوی احمد علی صاحب مرحوم سے حدیث پڑھنے گئے تھے۔ چنانچہ دورہ ختم کر کے سند حاصل کی۔ فرماتے تھے کہ سہارن پور میں رجال اور اسانید کی تحقیق علی گڑھ سے زائد تھی مگر کتاب اور حدیث کا مطلب اتنا ہی تھا جتنا علی گڑھ میں تھا۔

دوسرا واقعہ خود ان کے والد کی زبانی۔ موصوف نے علی گڑھ میں ادب عربی دوسرے فنون کے ساتھ پڑھا تھا۔ یہاں سے جا کر لاہور میں مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم ادیب نامور سے پڑھا۔ بعد فراغ کہا کرتے تھے کہ لاہور میں ایامِ عرب وغیرہ کا بیان بے شک بیشتر تھا، لیکن اشعار کا مطلب علی گڑھ کے درس سے زیادہ نہ تھا، انتہٰی۔ مولوی صاحب کو ملا عبد الحکیم سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتاب دانی اور حل مطالب کا اعتراف تھا۔

تکفیر سے احتراز | مولوی صاحب کا مشرب بہت وسیع تھا۔ کبھی کسی کی تکفیر سے قلم آلودہ نہیں فرمایا، نہ کبھی مسائل اختلافی[1] کے مباحث میں

[1] مسائل اہل سنت کی مشہور کتاب "انوار ساطعہ" پر حضرت مولانا لطف اللہ کی تقریظ آخر میں ملاحظہ فرمائیے حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اشرف قادری۔

حصّہ لیا، حیدر آباد سے ایک خط میں فرزندِ دلبند کو لکھتے ہیں کہ:
"حلّتِ زاغ کے مسئلے میں مخالف اور موافق دونوں فریق مجھکو لکھ رہے ہیں اور میری رائے کے جویا ہیں مگر میں اس اختلافی مسئلے پر کچھ نہ لکھوں گا۔ اسی وسعتِ مشرب کا ظہور ندوۃ العلما کے قیام و ترقی میں ہوا۔

تصنیف | کبھی کوئی تصنیف نہیں کی، تمام وقت اور قوّتِ علمی پڑھانے میں صرف فرمادی۔

فارسی شعر کہتے تھے زیادہ تر تاریخیں۔ بعض منظوم خط شاگردوں کے نام محفوظ ہیں۔ کلام صاف حشو و زوائد سے پاک ہے۔ ایک نعتیہ شعر سن لو

مرا بسوئے خود اے فخرِ انبیا برکش
کہ برتری ز سلیمان و کمترم از مور

جملہ معترضہ: انگریزی اس قدر جانتے تھے کہ بوقت ضرورت تار وغیرہ پڑھ لیتے تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جس زمانے میں کان پور میں مدرس تھے، ایک سال وبائی ہیضہ وہاں پھیلا۔ موصوف نے ایک تار اسی اثنا میں والد بزرگوار کے نام کسی ضرورت سے بھیجا۔ مولوی صاحب تار پاکر قدرۃً گھبرا گئے۔ مضطربانہ ایک بابو کے پاس جاکر پڑھوایا۔ اسی روز ارادہ کیا کہ انگریزی اتنی حاصل کرلینی چاہئے کہ

ایسی ضرورتوں میں محتاج نہ رہے۔ چنانچہ بطور خود مطالعہ کرکے استعداد حاصل فرما لی۔

ندوۃ العلماء کی صدارت

ندوۃ العلما جیسی ہمہ گیر مجلس کی صدارت کے لئے ایسا ہی مقبول عام صدر نشین زیبا تھا جیسے کہ مفتی صاحب تھے۔ اس مجلس کی بنیاد مدرسۂ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے جلسوں میں پڑی تھی، اوپر پڑھ چکے ہو کہ یہ مدرسہ سات برس مفتی صاحب کے درس سے فیض یاب رہا تھا۔

شوال سنہ ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا۔ ایک شان یہ بھی تھی کہ ہر فرقے کے صنادید علما شریک جلسہ تھے، علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین صاحب کنتوری شریک جلسہ تھے۔ یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علما بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و توقیر میں یکساں سرگرم تھے۔ کرسی صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی۔ تحریک صدارت مولوی عبداللہ صاحب ناظم دینیات محمڈن کالج علی گڑھ نے کی، تائید ثانی شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے کی۔ تقریر تائیدی میں یہ الفاظ بھی تھے۔

"...... مولنا محمد لطف اللہ صاحب کو چونکہ خداوند تعالیٰ نے بسبب عمر و علم کے بزرگی بخشی ہے اور ان کے نام سے خود لطف اللہ مترشح ہے، لہٰذا ہمارے واسطے ایسے بزرگ کا میرمجلس ہونا باعث خیر و برکات اور لطف اللہ ہوگا۔"

مولوی شبلی صاحب بھی موئدین میں تھے، اس موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا اس میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب کی بڑی شان دار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی۔

اس جلسے میں ایک واقعہ قابل بیان پیش آیا۔ سہ پہر کے اجلاس میں جب مفتی صاحب داخل ہوئے تو دیکھا کہ عام شرکا کی صف میں دو یورپین بھی بیٹھے ہیں۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ پادری ہیں۔ مولوی صاحب نے علما کی نشست گاہ پر پہنچ کر فرمایا کہ چوں کہ یہ دونوں بھی اپنے مذہب کے عالم ہیں لہٰذا اس نشست گاہ پر بیٹھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ سب نے منظور فرمایا اور دونوں صاحب اوپر آکر بیٹھ گئے۔

دوسرے سال اجلاس لکھنؤ میں شرکت سے معذوری رہی۔ تیسرے برس بریلی کے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ یہ اجلاس بھی اپنی شان میں یادگار تھا۔ مخالفت کا دَور یہیں سے شروع ہوا۔ ان اجلاسوں میں خطبۂ صدارت کا فقدان برابر محسوس کیا گیا۔

اولاد | مفتی صاحب کی شادی جلبیسر میں سید رونق علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اس طرح صاحبزادوں کی والدہ اور دادی دونوں سیدہ تھیں۔

اولاد میں چھ لڑکے تھے، لڑکیاں علاوہ۔ لڑکوں میں محمد کرامت اللہ کا اوائل عمر میں انتقال ہوگیا تھا۔

سب میں بڑے مولوی عبد القادر مرحوم تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں درس نظامی سے فارغ ہوئے مولوی عبد الغنی خاں صاحب اور اپنے والد ماجد کے شاگرد تھے۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن مجددی قدس سرہٗ سے بعیت تھے۔ مولوی عبد الحی صاحب مرحوم فرنگی محلی سے مباحثِ علمی پر مراسلت رہتی۔ مدرسۂ فیض عام کانپور میں صدر مدرس رہے۔ علم رمل سے خوب سے واقف تھے۔ ۲۸ برس کی عمر میں دق کے مرض سے ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔ فارسی شعر کہتے تھے، ایک شعر سن لو۔

دلِ من شاد گردیدن نداند
مگر ایں غنچہ خندیدن نداند

منجھلے مولوی عنایت اللہ صاحب حکیم وحافظ تھے، بڑے بھائی اور والد ماجد کے شاگرد۔ طب سے خداداد مناسبت تھی۔ علاج خوب کرتے تھے۔ جامع مسجد میں اپنے والد ماجد کی جگہ تقرر حیدرآباد کے

زمانے میں کئی سال صدر مدرس رہے۔ وہاں سے بھوپال جاکر اوّل رکن مجلس العلما اس کے بعد مفتی مقرر ہوئے۔ وہیں ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔ سرکار عالیہ سلطان جہان بیگم صاحبہ کے ہمراہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے تھے، وہاں کے علما سے کلام اللہ، حدیث، قصیدۂ بردہ، دلائل الخیرات وغیرہ کی سندیں لائے تھے۔

تیسرے مولوی امانت اللہ صاحب فارغ التحصیل ہوئے، والد اور منجھلے بھائی کے شاگرد تھے۔ میں ان کا ہم سبق رہا۔ حیدرآباد مفتی صاحب کے ساتھ گئے اور فارغ التحصیل ہوکر لوٹے۔ منجھلے بھائی کے بھوپال جانے پر جامع مسجد میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ برسوں پورے انہماک اور اہتمام کے ساتھ جملہ علوم کا درس دیا۔ خاندانی فن ریاضی میں امتیاز تھا۔ بہت خاموش اور باوضع تھے۔ پورے مدرس تھے۔ سوائے پڑھانے کے کوئی مشغلہ محبوب نہ تھا۔ باسٹھ ۶۲ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہیں۔ پڑھا اور پڑھایا۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا۔ غفرلہم۔

چوتھے مولوی سلامت اللہ عربی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھی۔ درسی کتابیں ختم نہ کر سکے، حج سے مشرف ہوئے، عدم فراغ کی تلافی یہ ہے کہ نور نظر مولوی حفیظ اللہ جامع مسجد میں مسندِ تدریس پر بعد فراغ متمکن ہیں، ریاضی میں ترقی کر رہے ہیں۔

سب سے چھوٹے عبدالحمید انگریزی، فارسی پڑھی، آخرالذکر دونوں صاحبزادے بقیدِ حیات ہیں سلمہما اللہ تعالیٰ۔

مفتی صاحب کی دستارِ کمال میں ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ پانچ صاحبزادوں میں سے تین صاحب تدریس ہوئے، ایک پوتے۔

اولاد سے مفتی صاحب کو معمول سے زیادہ محبت تھی، اُن کی تھوڑی سی تکلیف بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ قضائے الٰہی کئی لختِ جگر آنکھوں کے سامنے پیوندِ خاک ہو گئے، سب سے زیادہ صدمہ مولوی عبدالقادر صاحب کی وفات کا تھا اور بجا تھا۔

تلامذہ | جو درس چونتیس ۳۴ برس مسلسل اور متفرق طور پر ستّر برس جاری رہا اس کے فیض یاب تلامذہ کا استقرا کون کر سکتا ہے، خصوصاً جب کہ شمار اور ضبط کی کبھی پروا بھی نہ کی گئی ہو۔ دریا مصروفِ مواجی رہا، امواج کی شمار کون کرتا!

حضرت کے شاگرد مولوی احمد الدین مدرس مدرسہ دان پور (باشندۂ سرحد) نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ ایک موقع پر ان کے وطن میں اہلِ علم کا مجمع تھا۔ مفتی صاحب کے فضل و کمال کا ذکر ہونے لگا۔ اسی ضمن میں شاگردوں کی کثرت کا تذکرہ ہوا۔ سلسلۂ کلام میں سرحد کے ایک خاص وسیع قطعے کے شاگرد شمار کیے گئے، معلوم ہوا کہ شاگرد

اور شاگردوں کے شاگرد ڈھائی سو کی تعداد میں مصروفِ تدریس تھے۔ میں اس بیان کو کذب پر محمول نہیں کرتا، تم کو اختیار ہے کہ مبالغہ مان کر اپنی ہمت کے مطابق تعداد کم کر دو، کتنا ہی گھٹاؤ جو تعداد رہے گی کثیر ہی رہے گی۔

خود مفتی صاحب اور صاحبزادوں کی تحریر سے تلامذہ کے جو نام معلوم ہو سکے درج ذیل ہیں۔ بعض نام میں نے اپنی یاد سے بھی بڑھائے ہیں۔

دیکھو گے کہ شاگردوں میں بہت سے علما ایسے ہیں کہ ان کے تذکرے لکھے جائیں تو علم میں اضافہ ہو۔

تین صاحبزادگانِ گرامی قدر مولوی عبدالقادر[1] صاحب، مولوی حافظ عنایت اللہ[2] صاحب، مولوی امانت اللہ[3] صاحب۔ مولوی سید محمد علی[4] صاحب کان پوری، مولوی عبدالغنی[5] خاں صاحب مئو رشید آبادی، مولوی احمد حسن[6] صاحب کان پوری، مفتی عبداللہ[7] صاحب ٹونکی، مولوی سید محمد اسحاق[8] صاحب پٹیالوی، مولوی عبدالحق[9] صاحب حقانی دہلوی، مولوی عبدالحق[10] صاحب فتح پوری، مولوی وحید الزماں[11] خاں وقار نواز جنگ، مولوی محمد اسحاق[12] صاحب اسرائیلی، مولوی محمد یعقوب[13] صاحب اسرائیلی، حکیم محمد یوسف[14] اسرائیلی، مولوی[15] سید ظہور الاسلام[16]

فتح پوری، مولوی الٰہی بخش پنجابی، مولوی عبدالقدوس پنجابی، مولوی فضل احمد افغانی (ریاضی میں ماہر وقت)، مولوی آل حسن مراد آبادی، مولوی بشیر احمد صاحب علی گڑھی (اب بھی استاد مکرم کے مدرسے میں سرگرم تدریس ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ)، مولوی فضل حق صاحب رام پوری صدر مدرس مدرسۂ عالیہ رام پور، حکیم عبدالقادر خاں شاہجہاں پوری افسر الاطبا ریاست بھوپال، مولوی قمر الدین اجمیری مدیر رسالہ آل التہذیب، مولوی نادر الدین، مولوی شمس الدین پنجابی، مولوی راغب اللہ پانی پتی، مولوی محمد اسحاق صاحب سنبھلی، مولوی ہدایت احمد جلیسری، مولوی عنایت اللہ پنجابی، مولوی دوست محمد خاں ساکن سکندرہ راؤ، مولوی محمد ہاشم سنبھلی (میرے ہمدرس)، مولوی سید عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ (میرے ہمدرس)، مولوی نور محمد پنجابی مدرس مدرسہ فتح پور ہنسوہ (عجب صاحب دل ہستی تھی)، مولوی الٰہ داد خاں بنگالی، مولوی احسان علی بنگالی، مولوی حافظ گوہر الدین، مولوی عبدالفتاح، مولوی حافظ محمد فائق مولوی ماجد علی مدرس مشہور، مولوی عبدالرزاق بنگالی، مولوی ملا مرید پنجابی، مولوی محمد عثمان وزیری مدرس مدرسۂ بھوپال، مولوی محب اللہ صاحب ولایتی خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔

مولوی پیر مہر علی شاہ صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی (ایک عالم خود
ان سے فیض یاب ہے) مولوی امان اللہ کشمیری، قاضی سعد الدین کشمیری،
مولوی ابو سعید، مولوی عبد اللہ پنجابی، مولوی شرف الدین، مولوی نور محمد
سندھی، مولوی عبد اللہ قائم گجراتی، مولوی عبد العزیز مدراسی، مولوی
عبد الصمد بنگالی (استاد کے شیدائیوں میں تھے) قاضی سراج احمد گجراتی،
مولوی محمد علی انبیٹھوی، مولوی سبز علی ولایتی، مولوی سیف الرحمن
ولایتی صدر مدرس مدرسہ فتح پوری وغیرہ، مولوی پُردل خاں ولایتی،
مولوی اخلاق احمد سہسوانی، مولوی حافظ محمد صدیق پوربی، مولوی
لطف الرحمن بردوانی (ریاست بھوپال میں تعلیم کے ڈائرکٹر رہے)،
مولوی پیر محمد ولایتی (مدرسہ جامع مسجد کول میں مدرس رہے) مولوی
گل محمد ولایتی مدرس ایضاً، مولوی حافظ کعب ظہیر، مولوی عبید اللہ
کاشغری، مولوی شیر محمد ولایتی، مولوی احمد الدین ولایتی، مولوی
میر عبد اللہ ولایتی، مولوی خداداد بنگالی، مولوی خواجہ محمد یوسف
وکیل مشہور، مولوی خواجہ محمد اسمعیل وکیل، مولوی رفیع الدین وکیل
حکیم رفیع الدین، حکیم شیخ محمد یوسف علی، مولوی قاری کرم الٰہی (فارسی و
تجوید کے اُستاد تھے) مولوی بدر الدین مدرس مسلم یونیورسٹی، مولوی
یونس خاں رئیس دتاولی، مولوی صدیق حسین (مدرس مدرسہ جامع مسجد،

میرے ہمدرس)، مولوی اظہر حسین بہاری حیدرآبادی (میرے ہمدرس اور مولوی اشرف حسین استاد حضور نظام مرحوم کے فرزند) مولوی حاجی عبدالرحمن خاں مارہروی، ننگِ تلامذہ راقم شروانی۔

اس درس کی ایک سعادت یہ بھی تھی کہ اکثر تلامذہ درس نظامی سے فارغ ہو کر گنج مرادآباد میں حضرت مولانا فضل رحمن مجددی قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کرتے۔ مثلاً سابقون اوّلون میں مولوی سید محمد علی صاحب کان پوری، مولوی عبدالغنی خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب حقانی، مولوی احمد حسن صاحب (مرید حضرت حاجی صاحب کے تھے، مگر پیر کی اجازت سے حاضر باش آستانہ مبارک رہے) متوسطین میں مولوی سید ظہورالاسلام صاحب، مولوی نور محمد صاحب پنجابی، متاخرین میں مولوی سید عبداللطیف صاحب، خاکسار راقم۔

حضرت پیر و مرشد کو بھی مفتی صاحب کے حال پر توجہ تھی، ایک بار کی حاضری میں مجھ سے فرمایا کہ مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو؟ عرض کیا یہ جانتا ہوں۔ فرمایا خدمت کرتے ہو؟ عرض کی بزرگ خدمت کرتے ہیں۔ دیکھو اس استفسار کی برکت، مفتی صاحب کی آخری حیات میں خاکسار کو بھی خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ والحمدللہ علیٰ ذلک۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ فہرست اپنی کوتاہ دامنی پر شرمسار ہے۔

خاتمہ و حاصل کلام | ایک مدرسِ اعظم کا مرقع سامنے ہی جس سے تم بہت سے سبق حاصل کر سکتے ہو۔

حبیب گنج۔ ضلع علی گڑھ
چہار شنبہ ۲۸ رمضان المبارک
سنہ ۱۳۵۱ھ

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی
(صدر یار جنگ)

———

قطعۂ تاریخ وفات ۲۸۶
از مؤلف

چون مولانا لطف اللہ
بودہ استاذ العلما

حسرت سالِ وفاتش بنال
آہ استاذ العلما بگفتا
۱۳۳۴ھ

بسم اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

حضرت استاذ الاساتذہ مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڑھی قدس سرّہٗ اکابرِ اہلِ سنّت میں نہایت ہی ممتاز شخصیت تھے، حضرت شیخ الاسلام پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت مولانا احمد حسن کانپوری، حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، حضرت مولانا عبدالحق حقانی (صاحبِ تفسیر حقانی)، اور نواب محمد حبیب الرحمٰن شروانی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ ان کے تلامذہ میں سے تھے۔

جلیل القدر علماء انہیں عقیدت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے حضرت مولانا عبدالسمیع رامپوری خلیفہ جلیل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہما اللہ تعالیٰ کی تصنیف مبارک "انوارِ ساطعہ" پر حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڑھی نے تقریظ تحریر فرمائی۔ حضرت مولانا عبدالسمیع رامپوری نے تقریظ سے پہلے آپ کا تعارف ان القاب سے کروایا:

صورۃ ما قرظہ و صنعہ الامام الہمام المقدام، رئیس الفضلاء، عریف العلماء الذی ذاع صیت فضلہٖ فی بلاد الاسلام عجماً و عرباً و شاع شرقاً و غرباً المشتہر بالالسنۃ والافواہ مولانا محمد لطف اللہ مد اللہ ظلالہ، والبقاہ۔

تقریظ بر انوارِ ساطعہ

الحمد للہ الّذی تخضع لہٗ النواصی و یطمع رحمتہ کل مطیع و عاصٍ والصلوۃ والسّلام

علیٰ من بعث داعیًا الی الدانی والقاصی وعلیٰ آلہ وصحبہ الذین زجروا الناس عن سلوک طریق الضلال وارتکاب المعاصی وبعد فیقول العبد المبتہل الی اللہ محمد لطف اللہ حشرہ اللہ تحت لواء نبیہ النبیہ یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ قد تشرفت بمطالعۃ ہذہ الرسالۃ الشریفۃ والصحیفۃ اللطیفۃ فوجدتہا بحرًا یخرج منہ اللؤلؤ والمرجان وجنۃ فیہا فاکہۃ ونخل ورمان وشمسًا انوارہا ساطعۃ ومرعًی فیہ التحقیق الانیق رائعۃ کیف لا ومؤلفہا من ہو فرید عصرہ ووحید عصرہ الذی علمہ وسیع وشانہ رفیع اعنی مولانا محمد عبد السمیع حرس ذاتہ واسعد اوقاتہ، ومضمونہا ذکر ولادۃ سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین حبیب رب العالمین علیہ من التسلیمات افضلہا ومن التحیات اکملہا وہذا ذکر لا یخفی علو شانہ و رفعۃ مکانہ تحیط رحمۃ ربنا الاعلیٰ بمکان یتشرف الناس فیہ بہذا الذکر الشریف و تحف الملائکۃ مجلسا یتحدون فیہ بہذا البیان المنیف واما طریق الفاتحۃ التی ہی من الرسالۃ لائحۃ فلیس فی استحسانہا ارتیاب اذ ہی لایصال الثواب الی الاموات الذین یتوقعونہ من الاقرباء والاحباب واما ما احدثہ السفہاء فیہا من الامور المنہیۃ فلا یحکم بجوازہ احد من العلماء المتبعین الشریعۃ السنیۃ للہ در مولف الرسالۃ فانہ قد اختار ما ہو مختار، وآثر ما ہو الماثور عن اجلۃ الاحبار ہذا والحمد لمن منہ الابتداء والیہ الانتہاء والصلوٰۃ والسلام الاتمان علی من اول المخلوقات نورہ ورحمۃ للعالمین ظہورہ۔

ترجمہ : سب تعریف اللہ کو ہے جس کو سب سجدہ کرتے ہیں
اور اس کی رحمت سب چاہتے ہیں اور درود و سلام ہو
ان پر جو ہر اعلیٰ و ادنیٰ کی ہدایت کو آئے اور ان کی آل و اصحاب پر جنہوں نے لوگوں کو
گمراہی سے روکا۔

کہتا ہے بندۂ عاجز محمد لطف اللہ کہ خدا اس کو قیامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لواء حمد کے نیچے کھڑا کرے۔ میں اس رسالۂ لطیفہ (انوارِ ساطعہ) کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ پایا اس کو ایسا دریا جس میں موتی اور مونگے نکلتے ہیں اور ایسا باغ جس میں میوے کھجور اور انار کے درخت ہیں اور ایسا سورج جس کے انوار بلند ہیں اور ایسی چراگاہ جس میں عمدہ تحقیق کی گائیں چرتی ہیں اور وہ ایسا کیوں نہ ہوتا اس کا مؤلف وہ شخص ہے جو اپنے دَور میں یکتا ہے، میری مراد مولانا عبدالسمیع ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا نگہبان ہو اور ان کی ذات اور اوقات میں برکت دے۔ اس رسالہ میں حضرت حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریفہ کے بیان کا اثبات ہے اور یہ ایسا ذکر ہے جس کی بلندیٔ شان اور عظمت کسی سے مخفی نہیں، ملائکہ اس جگہ کا احاطہ کر لیتے ہیں جہاں یہ ذکر شریف ہوتا ہے۔ اس رسالہ سے فاتحہ کا جو طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مستحسن ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ یہ ان اموات کو ثواب پہنچانا ہے جو احباب اور رشتہ داروں سے ثواب کے منتظر ہوتے ہیں۔ بعض ناواقف جو اس میں امورِ ممنوعہ کا ارتکاب کرتے ہیں، کوئی عالم انہیں جائز نہیں کہے گا۔ مؤلف "انوارِ ساطعہ" نے خوب کیا کہ وہی اختیار کیا جو اچھے لوگوں اور نقاد علماء نے اختیار کیا ہے۔ اللہ ہی کے لیے تعریف ہے کہ اسی سے ابتدا ہے اور اسی پر انتہا ہے اور کامل درود و سلام ان پر جن کا نور اول پیدا ہوا اور تمام عالم کیلئے رحمت ہوا۔

تحقیق الحق مسمیٰ باسمِ تاریخی حضور کی گیارہویں ۱۳۴۶ھ

پر

حضرت مولانا محمد سیّد مست اللہ، خلف الصدق حضرت مولانا لطف اللہ علیگڑھی کی تقریظ

جوابات سوالات مستفسرہ کے مطالعہ سے فقیر مشرف ہوا۔ دارالخلافہ دہلی کے خلیفہ مولوی محمد کفایت اللہ صاحب نے گیارہویں شریف کے جواز میں جو فتویٰ اور استرۂ حق وصداقت سے منکرین کی ناک جو جڑ سے کاٹی ہے اور ان کے سروں کی جو صفائی کی ہے عملاً خواہ جہلاً اختیاراً یا اضطراراً وہ مولوی صاحب کے فتوے سے ظاہر اور آشکارا ہے۔ عیاں راچہ بیاں، لیکن آنجناب نے اس فتویٰ کو گرد وغبار سے کچھ ایسا دُھندلا اور میلا کیا جس سے عوام الناس کی نگاہیں اس قمر کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اسی واسطے ذوالمجد الظاہر والفضل الباہر غائص بحار التحقیق فارس مضمار التدقیق حافظ حدود اللہ حامی سنتِ رسول اللہ جناب مولانا مولوی الصوفی حافظ محمد مظہر اللہ صاحب مداللہ ظلال افضالہٗ و البقاہ نے کمال متانت اور بڑی لیاقت سے اس گرد وغبار سے حقانیت کا نیرِ تاباں ظاہر کیا اور اس تفصیل کی تشریح اور اس اجمال کی تصریح قدوۂ ارباب التدریس

والتذکیر اسوۃ اصحاب التقریر والتحریر امام المناظرین مسکت المجادلین غیظ الضالین قالع اصول المبتدعین جناب مولانا المولوی الحاج الشاہ محمد عماد الدین صاحب اجری اللہ تعالیٰ فیوضہ الباقیۃ الصالحۃ الیٰ یوم الدین نے جس خوش اسلوبی اور معتدل طریقہ سے کی ہے، وہ اہلِ بصیرت وارباب تحقیق سے مخفی و پنہاں نہیں۔ افقِ تحقیق پر شموش براہین طالع اور فلک تدقیق پر اقمار صحیح لامع اہل حق کا اثبات واحقاق اور محمد عماد الدین بر قولِ مخالف بنیان شرح قائم کردہ از جواب ہائے مخالف فراگرفتہ ظرافتہائے نادرہ پیش انداختند۔ الحق فیہ والحق معہ۔

(حضرت مولانا) محمد سید مست اللہ غفرلہ، (خلف الصدق جناب ماہر الفنون حضرت مولانا المفتی محمد لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ علیگڑھی)

بحوالہ التحقیق الحق مسمّٰی باسم تاریخی حضور کی گیارہویں

انصاری بک ڈپو، لال چاہ دہلی ص ۳۹

خواجہ رضی حیدر
(کراچی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

ضمیمہ

جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جن علماء نے برِصغیر پاک وہند میں علمِ دین کی اشاعت و ترویج میں مؤثر حصہ لیا، اُن میں استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی کا اسمِ گرامی سرِفہرست ہے۔ آپ نے تقریباً ساٹھ سال تک پاک و ہند کے مختلف بلاد و امصار میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اور برِصغیر کے کم و بیش ہر مکتبہ فکر کے علماء نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کی ذات کو علماء درسِ نظامی میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آج بھی پاک و ہند کے کم و بیش تمام علماء کی سند آپ تک پہنچتی ہے۔

مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے پندرہ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جہادِ آزادی کے مجاہد اور علی گڑھ کے مفتی علامہ عنایت احمد کاکوروی سے جملہ کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ مفتی علامہ عنایت احمد کاکوروی کو اپنے اس عزیز شاگرد کی صلاحیت و لیاقت پر بڑا فخر تھا، چنانچہ جب آپ منتقل ہو کر بریلی پہنچے، تو آپ نے مولانا لطف اللہ کو بریلی میں اپنے اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کیا۔ ۱۸۵۷ء میں فتویٔ جہاد کی حمایت کرنے کے الزام میں مفتی عنایت احمد کاکوروی

گرفتار کر لیے گئے، چنانچہ مولانا لطف اللہ بریلی کی سکونت ترک کر کے ایک مرتبہ پھر علی گڑھ آ گئے اور یہاں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۲۷۷ھ میں مفتی عنایت احمد کی رہائی تک جاری رہا۔ مفتی عنایت احمد نے رہائی کے بعد کانپور میں مستقل سکونت اختیار کی اور مدرسۂ فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو بحیثیتِ مدرس اسی مدرسہ میں بلالیا۔ جہادِ آزادی کے بعد ہندوستان میں یہ پہلا مدرسہ ہے جو ایک سنّی عالم نے نہایت دھوم دھام سے قائم کیا۔ [۱]

مولانا حکیم قاری احمد مصنف "تاریخ مسلمانانِ عالم" نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا ہے کہ اس مدرسہ کے لیے کانپور کے ایک رئیس عبدالرحمان خان مالک مطبع نظامی نے سرمایہ فراہم کیا تھا، چنانچہ مدرسہ کے افتتاح کے لیے عبدالرحمان خان نے اپنے پیر و مرشد اویسِ دوراں حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کو کانپور آنے کی دعوت دی۔ یہی وجہ ہے کہ "مدرسہ فیض عام" سے حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کا تعلق آخر وقت تک قائم رہا۔ [۲]

مولوی عبدالحی رائے بریلوی نے بھی یہی لکھا ہے کہ مفتی عنایت احمد کاکوردی نے عبدالرحمان خان مالک مطبع نظامی کی دعوت پر مدرسۂ فیض عام قائم کیا تھا اور تین سال تک یہاں درس دیتے رہے۔ [۳]

---

[۱] محمد علی حیدر ص ۲۸۹ "تذکرہ مشاہیر کاکوردی" مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء

[۲] مولانا قاری احمد کی قلمی یادداشتیں، مملوکہ ولی حیدر ذاکر کراچی

[۳] مولوی عبدالحی ص ۳۴۲ نزہتہ الخواطر، جلد ۷

۱۲۷۹ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی سفرِ حج کے دوران جہاز ایک چٹان سے ٹکرانے کی وجہ سے غریق و شہید ہوئے، چنانچہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی مدرسہ فیض عام میں مدرس اوّل مقرر ہوئے اور سات سال تک اسی حیثیت میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ۱۲۸۵ھ میں آپ کانپور کی سکونت ترک کر کے علی گڑھ لوٹ آئے اور یہاں درس و تدریس کا آغاز کیا، کیونکہ علی گڑھ اور اس کے قرب و جوار میں عدم تقلید کے فتنے نے سر اٹھایا تھا اور خصوصاً محلہ اسرائیلیاں میں اس فتنہ کا بڑا زور و شور تھا۔

مولانا لطف اللہ علی گڑھی متصلب حنفی تھے اور تقلیدِ ائمہ اربعہ کو ملّتِ مسلمہ کے لیے ضروری تصوّر کرتے تھے۔ آپ نے اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، ترکِ تقلید کی مذمّت کی اور تقلید کی حمایت میں کئی رسالے تحریر کیے۔ متعدّد ایسے فتووں پر مہرِ تصدیق ثبت کی جو ترکِ تقلید کے رَد میں لکھے گئے تھے۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی اس سرگرمی سے غیر مقلّدین کو شدید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ آپ کو کسی نے زہر دے دیا۔ اگرچہ اس حادثۂ جانکاہ سے آپ جانبر ہو گئے، مگر علی گڑھ سے آپ کی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ درس و تدریس کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع ہو گیا اور آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بعد میں نواب حیدر آباد دکن کو جب اس سانحہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے آپ کو حیدر آباد بلا لیا اور ریاست کے مفتی کے عہدہ پر فائز کیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی تقریباً تین سال اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رخصت ہو گئے۔

مولانا فیض احمد نے حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی سوانح "مہر منیر" میں لکھا ہے کہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے ابتداءً کانپور اور پھر علی گڑھ میں علوم دینیہ کی اشاعت کے سلسلہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ہندوستان کے علمی حلقوں نے ان کا "استاذ العلماء" کے خطاب سے اعتراف کیا۔ اس دور کے نامور علماء دین میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے "استاذ العلماء" کے گلشنِ علم سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔ اس وقت مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی شاگردی فضل و کمال کی سب سے بڑی سند شمار ہوتی تھی۔

مولانا لطف اللہ علی گڑھی علماء ربانین کا نمونہ، زہد و تقویٰ اور خدا پرستی کا مجسمہ تھے، طبیعت بے حد مرنجاں مرنج پائی تھی۔ علماء ہمعصر کے ساتھ بعض فروعی مسائل میں اختلاف ہونے کے باوجود آپ نے ان کے خلاف کبھی تعصب و تشدد کا اظہار نہیں فرمایا۔ آپ کی مقبولیت کے لیے یہی سند کافی ہے کہ سُنّی اور دیوبندی دونوں مکاتیبِ فکر کے علماء کے دل میں بے حد احترام تھا۔

انہی پاک منش بزرگانِ دین کے انفاسِ قدسیہ کی برکت تھی کہ ایسے نازک دور میں جبکہ حکومتِ برطانیہ اور اس کے ہواخواہ ہندوستان میں علومِ اسلامیہ کو ختم کرنے کی ٹھان چکے تھے۔ مدارسِ اسلامیہ کا وجود باقی رہا اور علومِ دین کے سرچشمے جاری رہے۔[1]

برِصغیر پر انگریزوں کے مکمل تسلط کے بعد تعلیمی ڈھانچے میں بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ خصوصاً انگریزی تعلیم اس قدر عام ہوئی کہ انگریزی سے ناآشنا

---

[1] مولانا فیض احمد ص۷۵-۷۷ "مہرِ منیر" مطبوعہ گولڑہ شریف (راولپنڈی) ۱۹۷۳ء

افراد کے لیے حصولِ ملازمت کے دروازے بند ہو گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر کے عوام الناس کی ایک بڑی تعداد انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ایسے حالات میں مذہبی تعلیم کو نئے خطوط پر استوار کرنے کے لیے چند علماءِ اُمت نے مدارس اسلامیہ کے نصاب کی اصلاح کے لیے ۱۸۹۳ء بمطابق ۱۳۱۰ھ میں ایک تنظیم ندوۃ العلماء قائم کی، جس کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت میں ہوا۔

اس اجلاس میں دیگر علماء کے علاوہ اعلیٰحضرت عظیم البرکت مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا عُمر عادل کانپوری، مولانا عبد القادر بدایونی اور مولانا حکیم مومن سجاد کانپوری بھی شریک تھے۔ ندوۃ العلماء کا ابتدائی اجلاس دستار بندی، پہلے اجلاس کانپور اور دوسرے اجلاس لکھنؤ کی کارروائی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک خالص سُنّی تنظیم تھی اور اس میں شامل علماء کی اکثریت اہل سنت وجماعت سے تعلق رکھتی تھی، جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے قیام میں شامل افراد کا رابطہ عقیدت ایک روحانی مرکز سے بندھا ہوا تھا جس کا نامِ نامی اسمِ گرامی حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی تھا۔ تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں یہ ذاتِ گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی۔ سنت سنید، فقر و غنا، علم و عمل اور نور و معرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہو گئی تھیں۔[۱]

---

[۱] سید سلیمان ندوی صہ ۳۰۲ حیاتِ شبلی: مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء

سید سلیمان ندوی کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے، کیونکہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا وصی احمد محدث سورتی کی عقیدت کا مرکز حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی ذات تھی، بلکہ موخر الذکر دونوں بزرگ تو حضرت گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، مگر اس تنظیم کی ہندوستان گیر مقبولیت دیکھ کر چور دروازوں سے اتحاد بین المسلمین کا نعرہ لگا کر وہابی اور افضی افراد نے کارپردازانِ ندوہ سے اس قدر قربت حاصل کر لی کہ ندوہ کے منشور کے خدوخال نمایاں تبدیل ہو گئے۔

اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت نے کمرِ ہمّت باندھی اور علماء اہلِ سنّت کی ایک بڑی تعداد آپ کی ہم آواز ہو گئی، حتیٰ کہ اجلاس دوئم منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے اپنے صاحبزادے حضرت احمد میاں کو اجلاس ندوہ میں شرکت سے ممانعت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ وہ معاملاتِ نفس ہیں، لہٰذا وہاں جانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ [1]

ندوہ کے تیسرے اجلاس بریلی کے موقع پر اعلیٰ حضرت نے مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو ندوہ کے مفاسد سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ وہ یا تو ندوہ کی اصلاح کریں یا پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں تاکہ عوام الناس پر حق واضح ہو جائے۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت عظیم البرکت سے مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے اجلاسِ بریلی کے موقع پر ملاقات بھی کی، لیکن مولانا لطف اللہ علی گڑھی اپنے سیدھے پن کی وجہ سے اتحاد

---

[1] مکتوب مولانا سید محمد رضا سندیلوی، پوتے داماد مولانا شاہ فضل الرحمٰن ص ۹۳ مطبوعہ مکتوبات علماء و کلام اہلِ صفا بریلی سنہ ۱۳۱۴ھ

بین المسلمین کے دل فریب نعرے کے اسیر ہو چکے تھے، اور اصلاح ندوہ کو ضروری تصور کرتے ہوئے بھی اس سے کنارہ کشی یا ارکان ندوہ کی تطہیر کو خلافِ مصلحت سمجھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ندوۃ العلماء غیر مقلّدین کے ایک نشریاتی ادارہ کا روپ دھار چکا ہے اور اس پر مولوی عبدالحی رائے بریلوی کے بعد سے مسلسل غیر مقلدین کا تسلط برقرار ہے۔ ہر چند مولانا لطف اللہ علی گڑھی بھی بعد میں ندوہ کی کارکردگی سے مایوس ہوکر کنارہ کش ہو گئے تھے اور عملاً انہوں نے ندوہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ترک کر دیا تھا، لیکن عوام الناس کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے غیر مقلدین ان کا نام استعمال کرتے رہے اور آج بھی فریب دہی کی روایت پر قائم ہیں۔

ندوۃ العلماء کی سرگرمیوں میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی شرکت سے نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ سوادِ اعظم کو شدید صدمہ پہنچا تھا اور اکثر علماء اہل سنت و عوام اہل سنت نے فقہی معاملات میں مولانا سے رجوع کرنا ترک کر دیا تھا، کیونکہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے نزدیک کسی بھی مذہبی معاملہ میں مصلحت اختیار کرنا بہت خطرناک تھا اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی اصلاحِ ندوہ کے ضمن میں علماء اہل سنت کی حق شناسی کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ آپ کے خلاف اکثر رسائل اور کتب میں تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ اس وقت تک برابر جاری رہا، جب تک کہ آپ نے ندوۃ العلماء سے عملاً مکمل کنارہ کشی اختیار نہ کر لی۔

ندوۃ العلماء کی اصلاح کے سلسلے میں بریلی حیدرآباد دکن اور دیگر بلاد و امصار سے اس زمانے میں شائع ہونے والے رسائل میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے آپ کی ندوہ میں شرکت کے بارے میں استفسارات موجود ہیں۔ اس ضمن میں

مولانا سیّد خلاص حسین سہسوانی کا ایک رسالہ "حادثۂ جانکاہ مفتی لُطف اللہ" قابلِ ذکر ہے، جس میں آپ نے غیر مقلدوں کے خلاف مولانا کی مساعی کو یکجا کر کے چند وقیع سوالات کیے ہیں۔ [1]

مولانا لطف اللہ علی گڑھی چونکہ بنیادی طور پر متصلب حنفی اور پکے سُنّی تھے، اس لیے آپ ہمیشہ علماء اہل سنّت کا احترام کرتے رہے، حتیٰ کہ بریلی کے اجلاسِ ندوہ سے قبل ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ کو آپ نے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کو ایک مکتوب ارسال کیا جس میں اعلیٰ حضرت کو تحریر فرمایا: "آپ بفضلہٖ تعالیٰ اس زمانہ پُرفتن میں اسلام کے رُکنِ اعظم ہیں۔" [2]

پروفیسر عبدالقیوم نبیرۂ مولانا لُطف اللہ علی گڑھی جو مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کے سربراہ ہیں گزشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تھے۔ آپ نے راقم الحروف کو ایک ملاقات میں بتایا کہ الحمدللہ آج بھی ہندوستان میں اہل سنّت کا بول بالا ہے اور عوام الناس فقہی مسائل میں علماء اہلِ سنّت کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ بریلی سے جو آواز سو سال قبل اٹھی تھی، آج وہ ہندوستان میں گونج رہی ہے:

"مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام"

ہر شخص کا وظیفہ صبح و شام ہے اور یہ طے پا چکا ہے کہ حق وہی موقف تھا، جس پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت اور ان کے رفقاء کاربند تھے۔

---

[1] "حادثۂ جانکاہ مفتی لطف اللہ" مؤلّف مولانا اخلاص حسین، مطبوعہ مطبع اہل سنّت بریلی ۱۳۱۳ھ

[2] تحفۂ حنفیہ ص۱۵ محرم الحرام ۱۳۲۵ھ، مطبوعہ پٹنہ بہار

مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی وفات پر پورے ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی، ہزاروں تعزیتی خطوط ہر مکتبۂ فکر کی جانب سے علی گڑھ پہنچے تھے، مگر افسوس امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ عظیم تاریخی ورثہ تباہ ہو گیا اور آج کا مؤرخ حوالوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سید سلیمان ندوی نے جو اس زمانہ میں "معارف" اعظم گڑھ کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ "فاجعہ علمیہ" کے عنوان سے ایک تعزیتی نوٹ لکھا تھا اور مولانا کی ملی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مولوی لطف اللہ میں قدیم تعلیم و تربیت کی تمام خصوصیات بکمالِ وجوہ موجود تھیں، علم و اخلاق اور قدیم تعلیم و تربیت کا مایہ ضمیر تھا اور ان ہی محاسن کی بناء پر ہمارے علمائے قوم میں عزت، رسوخ اور اثر پیدا کرتے تھے۔ مولوی لطف اللہ کی ذات میں نہ صرف یہ محاسن جمع ہو گئے تھے، بلکہ وہ ان اوصاف میں عموماً اپنے اقران و اماثل میں ممتاز خیال کیے جاتے تھے۔ اشاعتِ علم خالصتاً لوجہ اللہ ہمارے علماء کا تمغۂ امتیاز رہا ہے اور مولوی لطف اللہ مرحوم نے اپنی عمر کا ایک حصہ اس نیک کام میں صرف کیا۔ ہندوستان میں آج جس قدر علمی سلسلے قائم ہیں جو علماء آج مسند نشین درس و تدریس ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے مولوی لطف اللہ کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی ہے۔"[1]

مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے تلامذہ میں جن علماء نے دائمی شہرت حاصل کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا احمد حسن کانپوری پنجابی، مولانا محمد علی مونگیری، پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی، مولانا وصی محمد سورتی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحق دہلوی، مولانا عبدالغنی کانپوری، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا حافظ عبدالقیوم کیمبلپوری، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا حکیم خلیل الرحمٰن خاں پیلی بھیتی، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا ابوسعید رحمانی فتحپوری، مولانا

---

[1] ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ، ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۶ء

سید احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا حافظ کریم بخش برکاتی علی گڑھی اور نواب حبیب الرحمن خاں شروانی وغیرہ۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی خالصتاً لوجہ اللہ علمی و ملی خدمات کے باوجود آپ کی شخصیت اور کارہائے نمایاں سے نئی نسل قطعی واقف نہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ فی زمانہ رائج تاریخی وسوانحی کتب مولانا کے تذکرہ سے خالی ہیں۔

یہاں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ علمِ تاریخ کو سائنسی بنیادوں پر ہندوستان میں جن افراد نے استوار کیا یا تو وہ سر سیّد احمد خان کے حلقۂ اثر میں شامل تھے یا پھر اہل حدیث تھے، اس لیے تاریخ کے صفحات پر کسی ایک ایسے شخص کا نام نہ آسکا جس نے ردِّ وہابیت یا عدمِ تقلید کی مذمت میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کے وہ طالب علم جنہوں نے حاصل مواد پر اکتفا کیا۔ آج تک حقیقت سے ناآشنا ہیں اور کسی ایسی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں جو فی زمانہ رائج تاریخی کتابوں میں موجود نہ ہو۔

بہر حال یہاں میرا اس جملۂ معترضہ سے مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم کو خود اپنے علماء و اسلاف کے تذکروں اور ان کی مساعی کو روشناس کرانے کی سعی کرنا چاہیئے تاکہ تاریخ کے طلباء کی آنکھیں کھلیں اور وہ مؤرخین متقدمین کے تعصب، بغض و عناد سے واقف ہوسکیں اور حالات کی صحیح تصویر ان کے سامنے آسکے۔

(لڑکوں کا خاندان)

مولانا لطف اللہ علیگڑھی

- ۱ مولانا عنایت اللہ
  - مولوی احمد اللہ — علی گڑھ میں حیات ہیں
  - جلیل اللہ
  - خلیل اللہ
  - شفیع اللہ — نوابشاہ میں ایک سکول میں ٹیچر ہیں
  - مولوی سمیع اللہ
  - مولوی نصر اللہ
  - مولانا ہدایت اللہ — نوابشاہ سندھ میں انتقال ہوا
- ۲ مولانا امانت اللہ
  - لاولد
- ۳ مولانا عبد القادر
  - عبد العزیز — بھوپال میں شاہی قیام الطعام کے نگران تھے
    - مظہر اللہ
    - اسد اللہ
- ۴ مولانا سلامت اللہ
- ۵ مولانا عبد الحمید
  - عبد المجید — کراچی میں سرکاری ملازم ہیں
    - مولانا حفیظ اللہ عیدی
  - مولانا عبد القیوم علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر ہیں وعظ بھی فرماتے ہیں

۱۔ بھوپال میں قاضی شہر تھے
۲۔ اپنے والد کے جانشین اور عالم تھے
۳۔ علم جعفر کے ماہر تھے
۴۔ عالم تھے
۵۔ سرکاری ملازم تھے

(لڑکیوں کا خاندان)

- مولانا لطف اللہ علی گڑھی
  - (لاولد تھیں)
  - ۲ زوجہ عنایت علی
    - امجد علی
      - محمد علی: المعروف پروفیسر محمد علی لطفی۔ عالم باعمل ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں اور ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے بھی نیشنل کالج میں پروفیسر ہیں۔
      - حامد علی: عالم جوانی میں علی گڑھ میں انتقال ہوا
    - ممتاز فاطمہ
    - استو بیگم
    - احمد علی (معروف خوشنویس تھے، علی گڑھ میں مقیم رہے اور حیدرآباد دکن سے ثریا رقم کا خطاب ملا)
      - سید علی: معروف خوشنویس ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں عمر تقریباً ۵۰ سال ہے
      - انوار فاطمہ
      - منور فاطمہ
      - مشرف علی (یہ بھی کراچی میں مقیم ہیں اور قومی سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں)

پاکستان کے موجودہ ایک سو سے زیادہ علماء کا مفصل تذکرہ

تعارف علماء اہلِ سنت

ترتیب: مولٰنا محمد صدیق ہزاروی

قیمت -/۲۱

خطۂ پاک سے تعلق رکھنے والے پونے دو صد علماء و مشائخ قدس اسرارہم کے مستند حالات اور قابل فخر خدمات

تذکرہ اکابرِ اہلِ سنّت

ترتیب مولٰنا محمد عبد الحکیم شرف قادری

مسئلہ شفاعت اور فضائل مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

تحقیق الفتوٰی اردو فارسی

تصنیف: عاشق رسول علامہ فضل حق خیرآبادی

ترجمہ و تقدیم: مولٰنا محمد عبد الحکیم شرف قادری

قیمت ۰۰ ـ ۲۷

فضل حق خیرآبادی اور اسماعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ

امتیازِ حق

جسے تاریخ کے پروفیسروں اور دانشوروں نے زبردست خراج تحسین پیش کیا،

تصنیف، جناب راجا غلام محمد صدر ادارہ ابطال باطل لاہور،

قیمت ۵۰ ـ ۷

صحابہ و اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فضائل و برکات
قرآن و حدیث اور ارشادات سلف کی روشنی میں

برکاتِ آلِ رسول

تصنیف: علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی

ترجمہ: مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری

بارگاہِ رسالت میں نامور شعرا کے استغاثوں کا
ایمان افروز مجموعہ

اغثنی یا رسول اللہ

صلی اللہ علیک وسلم

ترتیب: مولٰنا الحاج محمد منشا تابش قصوری

قیمت ۰۰ ـ ۶

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی خونچکاں داستان

باغی ہندوستان

تصنیف: بطل حریت علامہ فضل حق خیرآبادی

ترجمہ و تقدیم: عبد الشاہد خاں شروانی

قیمت ۰۰ ـ ۲۱

بے مثال خواص کی بنا پر دنیا کی تمام زبانوں پر
عربی زبان کی فوقیت پر منفرد کتاب

المبین

مولٰنا سید سلیمان اشرف بہاری

قیمت ۰۰ ـ ۱۵

مکتبہ قادریہ ـ جامعہ نظامیہ رضویہ ـ اندرون لوہاری دروازہ ـ لاہور